انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء

₹ 30/-

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء

سہ ماہی مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

مدیر: زبیر ملک فلاحی

مجلس ادارت

اشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	قصیم
ڈاکٹر عبد الباری فلاحی	دہلی
انیس احمد مدنی فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰ روپے
	بیرون ملک	۵ امریکی ڈالر
سالانہ زر تعاون:	اندرون ملک	۱۲۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰ امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۳۰۰۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰۰ امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

نمائندے

لندن :	رضوان احمد فلاحی
دہلی :	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ :	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی :	حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال :	نذر الحسن فلاحی
یو اے ای :	خالد حسن رشید فلاحی
قطر :	محمد اکرم فلاحی
کویت :	محمد سہیل فلاحی
سعودی عرب :	انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے:

☆ برائے ادارتی امور

۲۰۳-اے، آر، منتظر، امین آباد، لکھنؤ-18

موبائل: +91-9889650087

☆ برائے انتظامی امور وترسیل زر

عرفان احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح

بلریاگنج، اعظم گڑھ، یوپی 276121

موبائل: +91-9453757380

ای میل: hayatenau123@gmail.com

ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح کی مطبوعات

Rs. 15.00 | Rs. 100.00 | Rs. 40.00 | Rs. 75.00

Rs. 45.00 | Rs. 100.00 | Rs. 80.00 | Rs. 70.00

Rs. 120.00 | Rs. 100.00 | Rs. 100.00 | Rs. 45.00

IDARA-E-ILMIA, JAMIATUL FALAH

BILARYA GANJ, AZAMGARH, (U.P) -276121 INDIA

فہرست مضامین

- اپنی بات (اداریہ) — زبیر ملک فلاحی — 3

مقالات

- ویدک دھرم اور اسلام: تقابلی مطالعہ — علامہ اخلاق حسین دہلوی — 5
- دعوت دین کی عصری معنویت — مقبول احمد فلاحی — 15
- نومارکسیت اور اسلام — ڈاکٹر ملک ریحان احمد فلاحی — 39
- حقوق انسانی ... ایک روداد سفر — ابوبکر سباق سبحانی فلاحی — 43
- فلسطینی مزاحمت: شعور کا ارتقا یا انحطاط — ڈاکٹر محسن صالح — 51
- تبلیغ دین کے چند اہم اصول — اعجاز احمد قاسمی — 59
- حکیم محمد اکبر ارزانی اور ان کی علمی خدمات — ڈاکٹر عبدالباری فلاحی — 69
- جامعہ کے لعل و نہار — عبدالرقیب فلاحی — 75
- فہرست منتخب ارکان مجلس نمائندگان انجمن طلبہ قدیم — مقبول احمد فلاحی — 78
- غزل — محمد صابر ایوبی — 80

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اپنی بات

زبیر ملک فلاحی

پچھلے دنوں بابری مسجد کی زمین کی ملکیت کا فیصلہ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ نے سنایا۔ عدالت کے فیصلے پر مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے۔ سب سے اہم بات یہ رہی کہ سب نے عدالت کے فیصلہ کا احترام کیا۔ ہندوستان کے ہر امن پسند شہری کا عدالتی فیصلوں میں یہی رویہ ہونا چاہیے۔ نفس فیصلہ پر غیر جانب دار ماہرین کا ردعمل یہ تھا کہ یہ فیصلہ نہیں بلکہ سیاسی تقاضوں کی تکمیل تھی۔ بعض نے اسے قابل افسوس، نا قابل فہم اور پنچایت کا فیصلہ کہا۔ ایک رائے یہ بھی سامنے آئی کہ ایسے مقدمات کے فیصلہ پر عدالتوں کو اختیار ہی نہیں حاصل ہے۔ بہر حال عدالت کا فیصلہ فیصلہ ہے، اس کے موافق یا مخالف جو بھی اقدام کرنا ہو اسے قانونی دائرہ ہی میں ہونا چاہیے۔

مذکورہ فیصلہ پر عمل درآمد یا اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ایک بات ہے۔ اس فیصلہ کی وجہ سے بعض دیگر مسائل ذہن میں آتے ہیں مثلاً ہمارے ملک میں ایک طبقہ تاریخ کے پہیے کو الٹا گھما کر تاریخی غلطیوں کی تصحیح چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا پورا منصوبہ ہے۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے افراد سازی ہو رہی ہے، لٹریچر تیار کیا گیا ہے۔ تنظیم کھڑی کی گئی ہے۔ سرکاری محکموں میں کلیدی مناصب پر اس منصوبہ میں رنگ بھرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد بٹھائے گئے ہیں۔ تاریخ کی ایسی غلطیاں جن کی تصحیح کرنی ہے، ان کی لمبی فہرست ہے۔ ایسے ماحول میں کیا اس فیصلہ کو تصحیح تاریخ کی عدالتی کوشش نہیں کہا جا سکتا ہے؟ اور اگر کہا جا سکتا ہے تو بھلا اس سے بھیانک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک کی انتظامیہ اور مقننہ کے دوہرے معیاروں کا حال تو سب پر روشن ہے۔ صرف ایک عدلیہ پر اعتماد تھا۔ اس فیصلہ کے نتیجے میں یہ اعتماد کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ یہ تو جان بوجھ کر دیوار سے لگانے کا عمل ہے۔ قانون کے احترام اور قانون کو ہاتھ میں لینے کے درمیان عدلیہ ایک حد فاصل ہے۔ اگر جان بوجھ کر اسے بھی ختم کر دیا جائے تو بھلا باقی کیا بچتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تشدد کی طرف دھکیلنے کا یہ سوچا سمجھا منصوبہ ہو؟

ہندوستان ایک کثیر ثقافتی معاشرہ ہے۔ بے شمار مذاہب، مسالک، دھرموں اور مذہبوں کے لوگ

زمانہ قدیم سے یہاں رہتے بستے چلے آرہے ہیں۔ ماضی کے تاریخی واقعات میں تلخ و شیریں سب کچھ موجود ہے۔ اگر انھیں کی بنیاد پر آج کے ہندوستان کی اٹھان ہوگی تو گویا تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہرائے گی اور اس کے نتیجے میں ایسے ایسے عفریت منصۂ شہود پر نمودار ہوں گے جو ملک کے سارے باشندوں کی زندگی اجیرن کردیں گے۔ عدالت کا موجودہ فیصلہ ان عفریتوں کے لیے راہ ہموار کرنے کا عمل ہے۔ انھیں درندگی پر ابھارنے کی تحریک ہے۔

امن عدل و انصاف کے بطن سے جنم لیتا ہے اور عدل و انصاف کا واحد معیار حق و صداقت ہے۔ اس سے انحراف بذات خود ظلم ہے۔ ہم ظلم کی تخم ریزی کر کے امن و انصاف کی فصل نہیں اُگا سکتے۔

ہم ہندوستان میں سیکولرزم کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا سیکولر عدالتیں یوں ہی فسطائی مصالح پر مبنی فیصلے جاری کرتی ہیں۔ بعض دانشوراسے سیکولرزم کی لچک سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی گنجائش بھی سیکولرزم ہی میں ممکن ہے۔ ظلم کی پردہ پوشی اور مظلوموں کو دام فریب میں الجھائے رکھنے کا یہ طریقہ آج کل بین الاقوامی سطح پر بڑا مقبول اور کارگر ثابت ہورہا ہے۔ کیا خوب ہے کہ ایک ملک، ایک مخصوص آبادی کو تہس نہس کردیا جائے اور ایک نظام کے مظالم کو ایک فرد واحد کے سر پر تھوپ دیا جائے اور اس سے گلو خلاصی کو انصاف کی جیت باور کرایا جائے۔ یہ تو گویا اس امر کا اعلان ہے کہ آپ بھی سیکولرزم کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ظلم کا بدلہ دوسروں پر ظلم کر کے لیجیے۔ حق و انصاف، نظام ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس ترقی یافتہ مہذب دور میں بھی اگر فیصلہ کن حیثیت کسی چیز کو حاصل ہے تو وہ قوت اور طاقت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حال ماضی سے جا ملتا ہے۔ بلکہ انسانی آبادی اور جنگل راج میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

بابری مسجد کے مسئلہ میں سپریم کورٹ میں اپیل حق و انصاف کو حاصل کرنے کی ایک سعی ہے لیکن حقیقی امن اور بے لاگ انصاف کی اگر طلب ہے تو پورے نظام کو بدلنا ہوگا۔ اس سے کم پر عدل و انصاف کی تمنا محض سراب ثابت ہوگی۔ والذی خبث لا یخرج الا نکدا۔

☆☆☆

ویدک دھرم اور اسلام: تقابلی مطالعہ

علامہ اخلاق حسین دہلوی

اسلام کا سنگِ بنیاد توحید ہے اور اس کے بعد تصورِ آخرت یعنی ایمانی قدروں کا کامل یقین۔ اس اجمال کی تفصیل قرآن حکیم میں یہ ہے:

اے ایمان والو! اللہ پاک پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ پاک کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ پاک نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی ہے اور ان کتابوں پر ایمان لاؤ جو پہلے نازل فرمائی ہیں اور جو کوئی اللہ پاک کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا انکار کرتا ہے تو تحقیق وہ بہت ہی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا انکار کرتا ہے تو تحقیق وہ بہت ہی گمراہ ہے۔

(سورہ النساء: ۱۳۶ پارہ: ۵)

الغرض یہ پانچ امور ہیں (توحید، رسالت، کتب سماوی، ملائکہ (فرشتے) اور آخرت) جن پر ایمان لانا لازمی ہے۔ یہی محور ہے اسلام و ایمان کا اور جملہ آسمانی مذاہب کا۔ یہاں ان ہی امور پنجگانہ کو فرداً فرداً اور تقابلی طور پر پیش کیا جاتا ہے تا کہ ویدک دھرم کی صحیح نوعیت واضح ہوجائے اور وہ غلط فہمی رفع ہوجائے جو عام طور پر اذہان پر مسلط ہے۔ وہ یہ ہے کہ ویدک دھرم آسمانی مذاہب میں سے نہیں ہے اور سراسر بے بنیاد تصور ہے۔

توحید

توحید یہ ہے کہ خدائے پاک ایک ہے، اکیلا ہے، اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے، کوئی بھی اس کے برابر نہیں ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ کوئی انتہا۔ اس کے نہ تو بیوی بچے ہیں اور نہ ماں باپ۔ نہ وہ کسی کا محتاج ہے اور نہ کوئی اس جیسا ہے۔ سارا عالم مخلوق ہے اور فانی ہے۔ وہ خالق ہے اور باقی ہے۔ سدا سے ہے اور سدا رہے گا۔ ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس کے حکم کے بغیر نہ پتہ ہی ہل سکتا ہے نہ کوئی ذرہ ہی حرکت کرسکتا ہے۔ وہی سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ وہی ایسا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے اور کسی کی نہیں۔

خدائے پاک کی توحید کے باب میں مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے بلکہ وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملہ آسمانی مذاہب میں یہی عقیدہ مروج رہا ہے جو آسمانی مذاہب کا سنگ بنیاد ہے۔ ہندو دھرم کی قدیم ترین کتاب وید مقدس میں بھی اسی عقیدہ توحید کی پرتو فگن ہے۔ محققین اس پر متفق ہیں کہ ہندوؤں کے تمام فرقے توحید پر متفق ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں (اپانشد) میں بھی خاطر خواہ یہ ذکر موجود ہے۔ ویدک دھرم میں لفظ اوم (ॐ) اسم ذات ہے۔ جو واحد ہے اور جو خدائے واحد کے لیے مخصوص ہے۔ جیسا کہ عربی میں بسم اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اسم ذات کی جمع بھی نہیں ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ توحید کے باب میں بنیادی طور پر ہندو مسلمان اور اہل کتاب متفق ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہے کہ ویدک دھرم فی الواقع آسمانی مذاہب میں سے ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا بھی ارشاد ہے کہ ”ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں۔“ (کاغذی مترجا ئمنہ درا)

رسالت

ایمانی قدروں میں توحید کے بعد اولین عقیدہ رسالت ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند قدوس نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔ جنھیں قدیم اور مختلف زمانوں میں اور مختلف اقوام میں مبعوث کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً رسول، نبی، پیغمبر، ہادی، نذیر و بشیر اوتار و خشور، میسنجر، پرافٹ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بزرگ ترین بندگان خدا ہیں اور ایسے معزز و محترم ہیں کہ انھیں کسی ایسے نام یا لفظ سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا جس کے معنی میں ادنیٰ سی بھی خفت یا رکاکت ہو۔ ان میں سے جنھیں اللہ تعالیٰ نے کسی آسمانی کتاب سے یا کسی صحیفے سے یا صحائف سے نوازا ہے انھیں رسول کہتے ہیں۔ رسولوں کی تعداد ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی جاتی ہے اور جنھیں کسی آسمانی کتاب سے یا صحیفے و صحائف سے نوازا نہیں گیا ہے اور جنھیں صرف نازل ہوئی کتاب کی تفہیم و ترویج اور تبلیغ و ہدایت کے لیے اللہ پاک نے مبعوث فرمایا ہے، انھیں نبی کہتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ عرف عام میں رسول کو بھی نبی کہتے ہیں مگر مراد صاحب کتاب ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کوئی قوم اور کوئی امت ایسی نہیں کہ ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے رسول اور نبی نہ بھیجے ہوں۔ خداوند قدوس کا ارشاد ہے:

”ہر امت (قوم) کے لیے رسول ہے (یونس: ۴۷، پارہ: ۱۱)“

”ہم نے ہر امت (قوم) میں رسول بھیجا ہے (النحل: ۳۶، پارہ: ۱۴)“

”کوئی امت ایسی نہیں گزری کہ جس میں نذیر (رسول) نہ بھیجا ہو (فاطر: ۲۴، پارہ: ۲۲)“

ہندو پاک قدیم سے نہایت وسیع (برصغیر) زرخیز مردم خیز ملک ہے۔ بقول محقق شہرستانی (ابو الفتح

محمد) ہندو ایک بڑی قوم ہیں اور ان کا ایک بڑا مذہب ہے“ (کتاب الملل والنحل ۵۲۱ھ ۱۱۲۷ء) پھر کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ ہندو قوم کی ہدایت کے لیے رسول اور نبی مبعوث نہ ہوئے ہوں؟ سرزمین ہند مہبط حضرت آدم علیہ السلام تو بالاتفاق ہے ہی۔ حضرت آدمؑ کے نامی گرامی صاحبزادے حضرت شیثؑ ہندوستان ہی میں ہوئے جن پر پچاس صحیفے نازل ہوئے اور مشہور ہے کہ ان کا مزار پُر انوار اجودھیا میں ہے، دو ٹیلوں کے درمیان۔ حضرت ادریس اور حضرت الیسع (وال زائد ہے) بھی نبی نام ہیں۔ ذوالکفل میں کفل کو کپل کا معرب بتایا جاتا ہے۔ کتب تاریخ میں کچھ اور نام بھی ملتے ہیں جو ہندوستان میں بطور ہادی گزرے ہیں۔

شری رام چندر جی ہندوستان کے پیشواؤں میں برگزیدہ ترین شخصیت کے مالک ہیں۔ ”اہل نظر سمجھتے ہیں اسی کو امام ہند“ (اقبال) اور شری کرشن جی جو تقریباً چودہ سو قبل مسیح کی برگزیدہ شخصیت ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ارشاد یہ ہے:

”ہندو قوم کے بڑوں کو مثلاً رام چندر و کرشن .... نام لے کر کبھی برا نہ کہو اور کوئی توہین آمیز کلمہ ان کی شان میں زبان سے نہ نکالو۔ ممکن ہے کہ اپنے وقت میں یہی مردان حق رہے ہوں جو بطور ہادی و نذیر (نبی و رسول) بھیجے گئے ہوں اور شرائع حقہ لے کر ہندوستان کی اصلاح کے لیے آئے ہوں لیکن مرور ایام سے بعد کے لوگوں نے ان کی شریعتیں مسخ کر دی ہوں۔ (اسلام و فرقہ واریت)

مدعا یہ ہے کہ اگرچہ نہ تو ان بزرگوں کے معتبر حالات زندگی ہی دستیاب ہوتے ہیں نہ تعلیمات محفوظ رہ سکی ہیں۔ تاہم ان بزرگوں کے نقوش عظمت جو فضا میں منتشر ہیں اور مٹائے نہ مٹ سکے ہیں، وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ بلاشبہ یہ بزرگ ہندوستان کے بزرگ ترین نبی و رسول ہی ہوئے ہیں اس لیے انھیں احترام ہی سے یاد کرنا چاہئے۔ یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں یا کسی دوسری زبان میں یہ بزرگ دوسرے ناموں سے یاد کیے گئے ہوں جیسا کہ ہوتا رہا ہے یا ان میں ہوں جن کے متعلق اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے:

”وہ بھی رسول ہیں جن کا ذکر آپ سے کیا ہے اور وہ بھی رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا ہے۔“ (النساء: ۱۶۴، پارہ: ۶)

بہر حال عرب محققین اہل قلم ہندو قوم کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت صابئین سے ہے۔ (طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی) جو حضرت شیثؑ اور حضرت ادریس کی امت ہیں۔ اور قدیم ترین امت ہیں۔ برہمن اور مجوسی ان موحدین کی نسل سے ہیں جو حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی امت میں تھے اور نمرود بادشاہ کے جور وستم سے خاطر برداشتہ ہو کر تارکِ وطن ہو گئے تھے اور ایران میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اور پھر ان میں سے کچھ ہندوستان میں آ بسے تھے۔ ان ہی کو آرین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف گروہ بعض عقائد و خیالات میں اور تہذیبی اور مذہبی رسومات میں مشترک بھی ہو گئے اور ہندی و غیر ہندی ایک ہو گئے۔ البتہ مجوس کی مثل بعض نے اپنی بعض خصوصیات کو محفوظ بھی رکھا جو کچھ نہ کچھ اب تک پائی جاتی ہیں۔

صابئین و مجوس کا ذکر قرآن مقدس میں بھی ہے اور اہل کتاب ہی کے ساتھ ہے (سورۃ الحج پارہ: ۱۷) اور ان دونوں امتوں کو بالاتفاق اہل کتاب مانا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یعنی صابئین ہونے کے ناطے ہندو قوم بھی اہل کتاب ہی کی مثل ہے اور بعض رسولوں کو ماننے کے لحاظ سے باب رسالت میں مسلمانوں سے قدرے قریب بھی ہیں کہ کلیۃً رسولوں کے منکر نہیں ہیں۔ مسلمان خداوند قدوس کے ارشاد کے مطابق سب ہی نبیوں اور سب ہی رسولوں کو مانتے ہیں۔ رسالت کی حیثیت سے ان میں فرق بھی نہیں مانتے ہیں۔ اس لیے کہ مومنوں کے متعلق خداوند قدوس کا ارشاد ہے:

”ہم اس کے رسولوں میں فرق نہیں کرتے“ (البقرہ: ۲۸۵ پارہ: ۳)

ہندو رسول کو اوتار کہتے ہیں۔ پرانوں اور شاستروں میں لفظ کلکی اوتار یعنی پیغمبر ہی ہے۔ مسلمان حضرت محمد رسول کو پیغمبر آخر الزماں مانتے ہیں اس کیوں کہ خداوند قدوس کے ارشاد کے مطابق دین کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اس لیے آئندہ کسی رسول کے بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور میں نے اپنی نعمتیں تمہارے لیے پوری کر دی ہیں اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔“
(المائدہ: ۳ پارہ: ۶)

لہٰذا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی خاتم النبیین اور کلکی اوتار ماننا ہی چاہیے۔

کتابیں

ایمانی قدروں میں آسمانی صحیفوں کو ماننا اور یقین کرنا شامل ہے۔ یہ تو اللہ پاک ہی کو علم ہے کہ کتنی کتابیں اور کتنے صحیفے نازل فرمائے ہیں۔ ہمیں جس طرح معدودے چند رسولوں کے اسمائے گرامی بتائے ہیں اسی طرح معدودے چند کتابوں اور صحیفوں سے آگاہی بخشی ہے۔ کتابوں میں توراۃ۔ زبور۔ انجیل اور قرآن حکیم اور صحیفوں میں صحف ابراہیم و موسیٰ اور صحف الاولیٰ سے مجملاً آگاہ فرمایا ہے۔

ویدک دھرم والے کتاب مقدس رگ وید کو اولین آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ تحقیق حاضرہ کے اعتبار سے بھی دستیاب ہونے والی قدیم کتابوں میں رگ وید مقدس ہی اولین کتاب ہے۔ ابھی تک اس سے قدیم کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ شیخ اعظم سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ سرزمین ہندوستان ہی وہ سرزمین ہے جہاں سب سے پہلے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ (سبحۃ المرجان) اس بیانِ حق ترجمان سے بھی مقدس رگ وید کی اولیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ تحقیق حاضرہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ مقدس رگ وید کا کچھ حصہ صحف ادریس سے متعلق ہے جن کا نزولی اعتبار سے تیسرا مقام ہے اور کچھ حصہ زبور مقدس سے متعلق ہے۔ اگر تحقیق سے اتنا اور بھی ثابت ہو جائے کہ مقدس رگ وید کا باقی حصہ صحف آدم و شیث سے متعلق ہے تو اس کا اولین صحائف میں سے ہونا ثابت ہو جائے اور کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ کتب سماوی میں مضامین متحد ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”جو کچھ آپ سے کہا جا رہا ہے اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو آپ سے پہلے رسولوں سے نہ کہی گئی ہو۔“ (حم سجدہ: ۴۳ پارہ: ۲۴)

اس کا حاصل یہ بھی ہے کہ جو کسی ایک آسمانی کتاب کو مانتے ہیں۔ وہ مضمون کی یکسانی کی بنا پر گویا جملہ آسمانی کتابوں کو ماننے میں تکلف نہیں کر سکتے۔ جس طرح سارے نبیوں اور رسولوں کو ماننا لازم ہے، اسی طرح تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو ماننا لازم ہے۔ نہ ماننے سے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔ کتبہٖ سے مراد یہی ہے کہ تمام ہی کتابوں کو مانا جائے۔ مسلمان از اول تا آخر تمام ہی آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو مانتے ہیں۔ اس لیے اللہ پاک کے ارشاد کے مطابق مان لینے میں خیر ہی خیر ہے۔ نہ ماننے میں سراسر نقصان ہے۔ اہل کتاب بھی بعض آسمانی کتابوں کے ماننے میں اہل کتاب کی مثل ہیں۔ جہاں تک کتب آسمانی کو ماننے کا تعلق ہے۔ اہل کتاب اور ویدک دھرم والے مسلمانوں سے قریب ہی ہیں۔ ناستک اور منکر نہیں ہیں۔ اگر وہ سب ہی کتب سماوی کو مان لیں تو اس میں بہتری ہی بہتری ہے کہ اللہ پاک کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ آخری آسمانی کتاب قرآن حکیم ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہے نہ ہوگی۔ مسلمان بھی اسے آخری کتاب آسمانی مانتے ہیں جو بالکل محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی کہ اللہ پاک خود اس کے محافظ ہیں۔ خداوند قدوس کا ارشاد ہے:

”بیشک ہم ہی نے قرآن حکیم کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“
(الحجر: ۹ پارہ: ۱۴)

قرآن حکیم شریعت و ہدایت کا جامع ہے۔ اس کو ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے میں دین کا بھی بھلا ہے اور دنیا کا بھی۔ مسلمان جو ناکام ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم پر عمل

کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر پوری طرح عمل کریں تو آج بھی کامیابی ان کے قدم چومے۔

ملائکہ

ملائکہ یعنی فرشتے نوری مخلوق ہیں۔ جو نہ مرد ہیں اور نہ عورت اور تابع فرمانِ الٰہی ہیں۔ ان میں سے بعض کے سپرد تکوینی خدمات بھی ہیں۔ انہیں مدبّراتِ امر (نازعات: ۵ پارہ: ۳۰) کہتے ہیں۔ فرشتوں میں چار فرشتے نہایت معزز اور مشہور ہیں۔ (۱) حضرت جبرائیل ہیں جو وحی رسانی اور حکم الٰہی پہنچانے پر مامور تھے۔ (۲) حضرت عزرائیل ملک الموت ہیں۔ جو موت و انتقال کی خدمت پر مقرر ہیں۔ (۳) حضرت میکائیل ہیں جو بارش برسانے اور مخلوق کو رزق پہنچانے پر مقرر ہیں۔ (۴) حضرت اسرافیل ہیں جو قیامت کے دن صور پھونکنے یعنی قیامت کی آمد کا اور اس کے اختتام کا بگل بجانے پر متعین ہیں۔ بعض فرشتے اور کاموں پر مقرر ہیں۔ آسمانی مذاہب کے سب ہی پیرو فرشتوں کے قائل ہیں۔ ویدک دھرم میں بھی فرشتوں کے وجود کا عقیدہ موجود ہے۔ ویدک دھرم والے فرشتوں کو دیوت اور سُر کہتے ہیں۔ دیو بھی کہتے ہیں۔ اور دیوتا بھی۔ ملک الموت یعنی حضرت عزرائیل کو یم دوت کہتے ہیں۔ یجر وید میں ہے:

''یم دوت نکوکاروں کے حوصلے اور ہمت کو بڑھا دیتے ہیں۔ انکی سواری سے نوازتے ہیں جس سے وہ فضائے کون و مکاں کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ انہیں پر پرواز عنایت ہوتے ہیں۔ جن سے وہ اڑتے ہیں، پرواز کرتے ہیں اور فلک الافلاک تک پہنچ جاتے ہیں۔ شہد، نکھن، دہی اور شرابِ طہورا (صاف ستھرے پانی) کی نہریں ہیں جن کے لیے مژدہ ہے کہ یہ جنتیوں ہی کے لیے ہیں۔''

یہ بیان عالم برزخ (پتر لوک) سے متعلق ہے۔ ویدک دھرم میں حضرت جبرائیل کو برہما کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور بہشت کے رضوان کو اندر دیوتا کہتے ہیں۔ اسی طرح دیگر ملائکہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ غرض کہ ویدک دھرم والے فرشتوں کو مانتے ہیں اور اس بات میں وہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے شامل ہیں اور یہ روشن دلیل ہے کہ ویدک دھرم بھی آسمانی مذاہب میں سے ہے۔

والیوم الآخر

تصورِ آخرت ایمانی قدروں میں آخری چیز ہے۔ اور اتنی اہم ہے کہ وجود باری تعالیٰ اور توحید الٰہی کے ساتھ ہی کئی جگہ اس کا ذکر ہے اور حق یہ ہے کہ اگر تصورِ آخرت نہ ہو تو انسان شتر بے مہار ہو جائے۔ نہ نیکی کی رغبت ہو اور نہ برے کاموں کے انجام کا اندیشہ دامن گیر ہو۔ سچ یہ ہے کہ تصورِ آخرت ہی سے زندگی سدھرتی ہے۔ آخرت سے مراد وہ عالم ہے جس کا آغاز موت سے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت بھی

آئے گا جب سارا عالم نیست و نابود ہو جائے گا اور پھر از سرِ نو تخلیق عمل میں آئے گی یعنی ہر ہر چیز عالم وجود میں آئے گی اور اللہ پاک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر حساب دینا ہوگا اور نیک و بد عمل کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ اسی کا نام قیامت اور حشر و نشر جسمانی ہے۔ مرنے کے بعد تا قیامِ قیامت عالم برزخ میں بھی نیک و بد عمل کے مطابق دکھ سکھ سے دوچار رہنا ہوگا۔ اگر یہاں اچھی گزری تو انجام بخیر ہے۔ جنت نصیب ہوگی اور نعمات جنت بھی، جن میں افضل ترین نعمت دیدارِ الٰہی ہے اور اگر یہی یعنی برزخی زندگی ہی میں سکھ چین نصیب نہ ہوا تو انجام بد کا اندیشہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خداوند قدوس رحیم و کریم ہے اور اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔ یقیناً وہ کرم فرمائے گا اور بہت سے گنہگار بندوں کی مغفرت فرمائے گا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی بداعمالی کے سبب سزا پائیں گے اور دوزخ میں رہیں گے۔ اور مدت سزا پوری کرنے کے بعد نجات پائیں گے۔ البتہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے جو مشرک مریں گے ان کی بخشش نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور دردناک، وحشت ناک دکھوں میں مبتلا رہیں گے۔ مسلمان اسی عقیدہ کے پابند ہیں بلکہ یہ عقیدہ تمام آسمانی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ ہندو مذہبیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ویدک دھرم میں بھی یہ عقیدہ کمالیت کے ساتھ موجود ہے جو کتب مقدسہ وید میں بھی ہے۔ یورپین محقق مسٹر الفنسٹن نے بڑی جامعیت و اختصار سے ہندوؤں کے تصورِ آخرت کے متعلق یہ لکھا ہے:

''وہ (ہندو) یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حیات کے مختلف درجوں سے ایک درجہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنتوں اور بہشتوں میں ہزار ہا برس تک عیش و عشرت میں رہے گا۔ یا نرکوں (دوزخوں) میں رہے گا اور ہزار ہا برس تکلیف اور عذاب سہے گا......'' ہندوؤں کے ہاں (معاد) (آخرت) کے عیش و آرام اور نعمتوں کا ذکر اور رنج و عذاب کا بیان نہایت مبالغے سے شاعرانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ جب نیک اور صالح آدمی کی روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو وہ نہایت خوشنما راستوں سے خوشبودار اور سایہ دار درختوں کے سایہ میں ایسی نہروں سے گزرتی ہے کہ جن میں بکثرت کنول کے پھول کھلے ہوتے ہیں اور بدکاروں کی روح کا گزر نہایت تنگ و تاریک اور خوفناک راستوں سے ہوتا ہے، کبھی جلتی ہوئی ریت سے اور سخت خاردار پتھروں سے ہوتا ہے جن سے قدم قدم پر پاؤں زخمی اور لہولہان ہو جاتے ہیں...... جن نرکوں (دوزخوں) میں رہنے کے لیے ان بدکاروں کو حکم ہوتا ہے۔ ان کی نسبت بھی کچھ ایسے ہی خیالات ہیں۔ ان کا حال کچھ اسی سنجیدگی سے بیان کیا ہے کہ دوزخ کا خوفناک

منتظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔" (تاریخ ہندوستان: الفنسٹن)

ہندو مذہبیات میں ایسے الفاظ بھی ہیں جو تصور آخرت کے ترجمان ہیں مثلاً پتر لوک (عالم برزخ) پرلے (قیامت حشر و نشر جسمانی) مکتی (نجات) عالم برزخ کا سکھ چین۔ مہا مکتی (نجات کبریٰ) (حساب کے بعد چھٹکارا پا کر داخل بہشت ہونا۔ (سورگ) (بہشت) بیکنٹھ (بہشت) نرک (جہنم-دوزخ) وغیرہ وغیرہ ان حالات سے یہ بخوبی واضح ہے کہ ویدک دھرم بلاشبہ آسمانی مذاہب میں سے ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تصدیق شہرۂ آفاق مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی (المتوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ آیت یا معشر الجن والانس الخ کی تفسیر میں یہ اہم ترین انکشاف فرماتے ہیں:

"اہل ہند کے اصول دین اکثر تو قرآن و سنت کے مطابق ہیں اور جہاں اختلاف ہے وہ شیطان کی کارستانی ہے۔" (تفسیر مظہری جلد ۴ ص ۲۱۸ سورہ انعام ۱۳۰ پارہ ۸ ترجمہ)

کسی مذہب کے آسمانی ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اس کے اکثر اصول دین قرآن و سنت یا بالفاظ دیگر آئین اسلام کے مطابق ہوں۔ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی کے بیان سے یہ واضح ہے کہ ویدک دھرم آسمانی مذاہب ہی میں سے ہے۔ اس اعتبار سے ویدک دھرم والے جسے اولین آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ ان کا ماننا بعید از قیاس نہیں ہے بلکہ اقرب از یقین ہے کہ وہ فی نفسہٖ توحید تصور آخرت کے عقائد سے مزین اور طاغوتی لغویات سے مبرا ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی نے آیۂ جزیہ حتیٰ یعطوا الجزیۃ کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے:

"میں کہتا ہوں اگر مجوسیوں کے اسلاف کا اہل کتاب ہونا ان مجوسیوں کے اہل کتاب قرار دینے کے لیے کافی ہے تو ہمارے زمانے کے یہ ہندو بت پرست بھی اہل کتاب ہو جائیں گے۔ ان کے پاس بھی وید نام کی ایک کتاب ہے جس کے چار حصے ہیں اور ان کا دعوٰی ہے کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ پھر ان کے اکثر اصول بھی شرعی اصول کے موافق ہیں اور جن اصولوں میں اختلاف ہے وہ شیطان کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جس طرح شیطانی تفرقہ اندازی سے مسلمانوں کی ایک جماعت پھٹ کر ۷۳ فرقے بن گئی ہے۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ "ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور گزرا ہے۔" مجوسیوں سے تو ہندو اہل کتاب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں...... مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ چوتھے وید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت مذکور ہے جس کو پڑھ کر بعض ہندو مسلمان ہو گئے ہیں۔" (تفسیر مظہری جلد ۵ ص ۲۴۰ ترجمہ)

حضرت قاضی ثناء اللہ کا یہ بیان فیصلہ قضاۃ کے مثل جامع و مدلل ہے جو ذہن کو حق کی جانب موڑتا ہے۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ "ان کے پاس بھی وید نام کی ایک کتاب ہے۔" "ان کا دعوٰی ہے کہ یہ خدائی کتاب ہے۔" اس بیان سے یہ مستفاد ہے کہ اگر کوئی امت کسی کتاب کے خدائی کتاب ہونے کا دعوٰی کرے تو یہ کہہ کر قرآن حکیم میں اس کا نام نہیں ہے، رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جنہیں قرآن پاک کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں سب ہی خدائی یا آسمانی کتابوں کے نام نہیں ہیں اس لیے کہ قرآن پاک میں فہرست کتب نہیں ہے البتہ صرف چار کتابوں کے نام واضح طور پر ہیں ورنہ مجملاً ذکر ہے۔ بلاشبہ متن کے مطالعے سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے اور رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ طاغوتی لغویات سے مبرا اور توحیدی ہدایات سے مزین ہے تو اس کا خدائی کتاب ہونا اقرب از یقین ہے۔ ہمیں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ انکار ہی کریں، تسلیم نہ کریں۔ البتہ الحاق و تحریف سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے جو نزولی کتب میں لاحق ہوتا رہا ہے البتہ قرآن کریم اس سے مستثنیٰ ہے۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ "ان کے اکثر اصول بھی شرعی اصول کے موافق ہیں۔" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "اہل ہند کے اصول دین اکثر تو قرآن و سنت کے مطابق ہیں۔" اکثر کا اقتضا یہ ہے کہ چاہے وہ دین ہے یا دینی کتاب اس کے حق ہونے سے انکار کرنا بذات خود گمراہی ہے البتہ خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل ہونا چاہیے کہ اگر بعض امور جو قرآن و سنت اور شرعی اصول کے خلاف ہوں تو بقول قاضی صاحب انہیں شیطان کی کارستانی اور شیطانی آمیزش کا نتیجہ قرار دے کر مسترد مانا جا سکتا ہے۔ لیکن اس آمیزش کی بنا پر نہ تو کسی کتاب کے خدائی کتاب ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے، نہ کسی مذہب کے آسمانی مذہب ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ کسی کتاب یا ایسے مذہب کو منسوخ مانا جا سکتا ہے مگر انکار ہرگز روا نہیں ہے۔

حضرت قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے" اور آیت قرآنی سے استدلال بھی فرمایا ہے۔ قرآن پاک سے تائید ہونا فیصلہ کن ہے۔ قرآن کو کلام الٰہی ماننے والے تو اس سے روگردانی کر ہی نہیں سکتے۔ اہل کتاب بہت معنی خیز لفظ ہے کہ اہل کتاب کا اطلاق ان پر ہوتا ہے جو کسی صاحب کتاب نبی کی امت ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وید مقدس جسے ہندو آسمانی اور خدائی کتاب مانتے ہیں وہ کسی ایسے رسول پر نازل ہوئی ہے جو ہندوستانیوں کی ہدایات کے لیے مبعوث ہوا ہے۔ لہٰذا نہ تو ویدک دھرم کے آسمانی ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ وید مقدس کے آسمانی ہونے سے صریحاً انکار کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ "چوتھے وید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت مذکور ہے" میں

کہتا ہوں کہ چوتھا وید ماخوذ ہے سابقہ ہر سہ کتب وید سے جنھیں ترےودیا (علوم ثلاثہ) کہتے ہیں۔ مبشرات (بشارتیں) دراصل کتاب رگ وید اور سام وید میں ہیں جو چوتھے وید (اتھروید) میں منقول ہیں۔ کتب ثلاثہ وید بہت قدیم ہیں۔ ہندو انہیں ایک بتاتے ہیں۔ غرض کہ یہ کتب مقدسہ نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قرنہا قرن پہلی ہیں۔ ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بشارتیں ہیں وہ بہت ہی حیرت انگیز ہیں۔ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے تاہم ان سے بھی ویدک دھرم کا آسمانی مذہب ہونا ثابت ہے۔

اب دو باتیں رہتی ہیں وہ یہ کہ ویدک دھرم والے یہ تسلیم کرلیں کہ جنھیں وہ اوتار مانتے ہیں ان کے علاوہ اوتار (رسول) بھی ہوئے ہیں جو اقوام عالم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں ان میں سے آخری رسول (کلکی اوتار) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ تسلیم کریں کہ وہ جس کتاب کو آسمانی کتاب اور قدیم ترین مانتے ہیں اس کے علاوہ بھی اقتضائے حال کے مطابق آسمانی کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے آخری کتاب قرآن حکیم ہے جو کامل ہے اور محفوظ ہے۔ اسی لیے مزید نہ کسی کتاب کے نزول کی ضرورت رہی ہے اور نہ کسی رسول کے مبعوث ہونے کی۔ اسلام دراصل مذاہب سابقہ کی آخری کڑی ہے۔ یہ دونوں باتیں بآسانی دل نشین کرائی جا سکتی ہیں اور مخاطب انھیں بآسانی قبول کر سکتے ہیں۔ مسلمان دانش وروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہمدردی اور دل لگن سے نیز موقع محل کی رعایت سے بہت سادہ اور دل نشین اسلوب میں اکثر و بیشتر اس طرح بیان کرتے رہیں کہ مخاطب یہ محسوس نہ کرے کہ بالجبر اسے مجبور کیا جا رہا ہے بلکہ یہ سمجھے کہ برسبیل تذکرہ یہ بات بھی کہہ دی گئی ہے۔ یقین ہے کہ اعادہ و تکرار کی برکت سے توفیق الٰہی سے بات دل نشین ہو جائے گی اور مدعا حاصل ہو جائے گا کہ ہندوستانی ایمانی نقطہ نظر سے متحد و متفق ہو جائیں گے بلکہ برکتوں سے مالا مال ہو جائیں گے۔

===☆===

دعوت دین کی عصری معنویت

مقبول احمد فلاحی

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے عصر حاضر کا تجزیہ کیا جائے اور پھر موجودہ حالات میں دعوت کے امکانات پر گفتگو کی جائے لیکن چونکہ عصر حاضر کا تجزیہ دعوتی نقطہ نظر سے کرنا ہے لہٰذا دعوت کو پہلے لیا جا رہا ہے اور اس پس منظر میں عصر حاضر کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

دعوت کا معنی اور مفہوم

عربی میں دعا، یدعو، دعاء، کے معنی پکارنا، بلانا، درخواست کرنا، نام دینا، نام رکھنا کے ہیں۔ دعا الی شی کے معنی محرک بننا، سبب بننا، آمادہ کرنا، دعوت دینا، اپیل کرنا ہے۔ دعوۃ و دعاءٌ کے معنی ندا، پکار، بلاوا، طلب، فرمائش اور درخواست کے ہیں۔ اور دعوۃ کے معنی دعوت، مشن اور پیغام ہیں۔

دعوت دین کے معنی دعوۃ الی دین اللہ۔ جو لوگ اللہ کے دین سے ناواقف ہیں انہیں اللہ کے راستے کی طرف بلانا۔ اس مطلوب اور مفہوم کی ادائیگی کے لیے قرآن نے دعوت دین کے بجائے دعوت الی سبیل رب اور دعوت الی اللہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

دعوت کا دائرہ ظاہر و باطن، فکر و وجدان، قول و عمل حتی کہ جن جن چیزوں سے کسی جانب رجحان ہوا جاتا ہے یا میلان کا اظہار ہوتا ہے، ہر ایک کو محیط ہے۔ انسان اور انسان کے سارے اعضا و جوارح اور باطنی عناصر سب اس کے مخاطب بنتے ہیں اور دعوت کا اثر ایک توازن کے ساتھ ہر سطح پر مرتب ہوتا ہے۔

دعوت الی اللہ کو ایک دوسرے جامع لفظ شہادت علی الناس سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ "و کذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا۔"

دعوت دین کے ارتقائی مراحل

حضرت محمد مصطفی ﷺ کو اللہ تعالی نے داعیاً الی اللہ و سراجاً منیرا کا مقام عطا کر کے روئے زمین پر رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔ آپ نے ذات باری تعالی سے مدد کی

پہاڑیوں میں سے ایک غار...... غارِ حرا...... سے کسبِ فیض کیا اور حکمِ الٰہی یاایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر کی تعمیل میں مکہ میں دعوت الی اللہ اور تکبیرِ رب کے کام کا آغاز فرمایا۔ اس حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اپنے مصروف ہوئے کہ حاکمِ اعلیٰ کو بھی آپ کی مشقتوں پر رحم آگیا اور فرمایا "لعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا۔"

آپ نے مکہ و اطرافِ مکہ میں ۱۳ سال تک دعوتی فریضہ ادا کیا، پھر مجبوراً بامشیت ایزدی کے تحت مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں مختلف جہات سے میدانِ دعوت میں دس سال تک انتھک محنت کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔"

اس ۲۳ سالہ دعوتی زندگی میں صحابہ کرام آپ کے شانہ بشانہ جملہ متاعِ حیات لٹا کر ساتھ لگے رہے اور فرضِ منصبی کی ادائیگی میں مصروفِ کار رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی رضا کا اعلان فرمایا۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ

حجۃ الوداع ۹ ھ میں مسلمانانِ عالم کا حج کے موقع پر اجتماعِ عام طلب کیا گیا۔ جبلِ رحمت کے دامن میں حضور اونٹنی پر سوار ہیں اور مسلمانوں کا مجمع آپ کے کلماتِ مبارکہ سننے کے لیے بے تاب ہے۔ حضور نے اس موقع پر دنیائے انسانیت کی دنیوی و اخروی نجات کے ایک منشور کا اعلان فرمایا، اور مسلمانوں کو بنیادی ہدایات سے نوازا۔ اس منشور کی ایک اہم دفعہ یہ تھی۔ آپ نے فرمایا: "مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے مجھے فریضہ شہادتِ حق کے منصب پر مامور فرمایا تھا۔ میں نے یہ فریضہ ادا کیا اب تم بتاؤ کیا میں نے دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کر دیا۔ مجمع نے ایک زبان ہو کر جواب دیا: ہاں اللہ کے رسول آپ نے اپنا کام کر دیا۔ آپ نے حق کی گواہی بلاکم و کاست دے دی۔ حضور نے فرمایا لوگو! تم سب گواہ رہو۔ میں نے اپنا کام انجام دیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ۔ تو نے جس مہم پر مجھے لگایا تھا، جو کام تو نے میرے سپرد کیا تھا اسے میں نے پورا کر دیا۔ اور اے لوگو! اب یہ کام تمہارے ذمہ ہے۔ اب تم دنیائے انسانیت کے درمیان حق کے گواہ ہو۔ شہادتِ حق اب تمہارے ذمہ ہے۔ یہی مفہوم ہے اس آیتِ کریمہ کا "وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً۔"

امت مسلمہ کی گواہی

تاریخ گواہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے اپنے فرضِ منصبی کا احساس کیا اور بڑے پیمانے پر دنیائے انسانیت کو ایک مدت تک جامِ توحید سے سیراب کرتی رہی۔ یہ مخلصین امت کی قولی و عملی گواہی کا نتیجہ

ہے کہ آج دنیا کے گوشے گوشے میں فرزندانِ توحید پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً سوا ارب تک پہنچ چکی ہے۔ شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے والے تاریخ کے ہر دور میں موجود رہے اور ان شاء اللہ قیامت تک ملت کے ذریعہ یہ فریضہ انجام دیا جاتا رہے گا۔ بلاشبہ آج بھی دنیا کے ہر حصے میں ایسے افراد، ادارے، تحریکیں اور انجمنیں موجود ہیں جو اپنے اپنے طریقے سے یہ فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ رفتہ رفتہ ملت کے اندر سے احساسِ فرضیت کم ہوتی گئی۔ ملت کا ایک بڑا طبقہ بے عملی کا شکار ہوتا رہا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ معدودے چند افراد یا اداروں کے استثناء کے ساتھ بحیثیت مجموعی پوری ملتِ اسلامیہ خوابِ خرگوش میں مبتلا ہے۔ اسے نہ اپنے تشخص کا شعور ہے نہ فرضِ منصبی کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری کثرتِ تعداد، کثرتِ وسائل، اور کثرتِ ممالک سب بے معنی ہو گئے ہیں۔ دوسروں کا گلہ شکوہ کرنے کے بجائے صحیح بات یہ ہے کہ ہم اپنی موت آپ مر رہے ہیں۔ پوری ملت جانکنی کے عالم میں ہے۔ ہر محاذ پر پسپائی ہمارا نصیب بن گئی ہے۔ کل کے گیدڑ آج شیر نظر آتے ہیں۔ فرضِ منصبی سے اعراض کے نتیجہ میں یہ اقدامی امت دفاع کی آخری سرحد چھونے لگی ہے۔

دعوتی پس منظر

درست رخ پر عصرِ حاضر کا دعوتی تجزیہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اجمالاً ہی سہی دورِ نبوی کا مختصر مطالعہ نہ کیا جائے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کا مناسب تعین وہ ہوگا جو دورِ نبوی کی صورتِ حال کے پس منظر میں کیا گیا ہو اور تعین میں داعی، مدعو، میدانِ دعوت، طریقۂ دعوت، مرحلۂ دعوت وغیرہ دعوت کے جملہ اجزاء ترکیبی کی بھی تعیین کی گئی ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام امور ہر پہلو مماثل ہوں۔ البتہ زیادہ سے زیادہ مناسبت کی تلاش ہونی چاہیے۔

مکی دور کے مراحلِ دعوت کے سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"جب ہم نبی ﷺ کی مکمل زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے وہ ہم کو چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے۔ (۱) پہلا دور آغازِ بعثت سے لے کر اعلانِ نبوت تک تقریباً ۳ سال۔ جس میں دعوت خفیہ طریقہ سے خاص خاص آدمیوں کو دی جا رہی تھی اور عام اہلِ مکہ کو اس کا علم نہ تھا۔ (۲) دوسرا دور اعلانِ نبوت سے لے کر ظلم و ستم اور فتنہ کے آغاز تک تقریباً ۲ سال۔ جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی پھر تضحیک، استہزاء، الزامات، سب و شتم، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھہ بندی تک نوبت پہنچی اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں

طرح ہو گئیں جو نسبتاً زیادہ غریب، کمزور اور بے یار و مددگار تھے۔ (۳) تیسرا دور ۵ ہجری سے لے کر ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ۱۰ نبوی تک تقریباً پانچ چھ سال۔ اس میں مخالفت انتہائی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ بہت سے مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ نبی ﷺ اور آپ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور آپ اپنے حامیوں اور ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب میں محصور کر دیے گئے۔ (۴) چوتھا دور ۱۰ نبوی سے ۱۳ نبوی تک تقریباً ۳ سال۔ یہ نبی اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی اور مصیبت کا دور تھا۔ مکہ میں آپ کے لیے زندگی دو بھر کر دی گئی تھی۔ طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلے سے آپ اپیل کرتے رہے کہ وہ آپ کی دعوت قبول کرے اور آپ کا ساتھ دے مگر ہر طرف سے کورا جواب ملتا رہا اور ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورہ کرتے رہے کہ آپ کو قتل کر دیں، یا قید کر دیں، یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ آخر کار اللہ کے فضل سے انصار کے دل اسلام کے لیے کھل گئے اور ان کی دعوت پر آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔"

(تفہیم القرآن جلد اول۔ تمہید سورۃ الانعام ص ۵۲۳)

☆ دعوت دینے والے اولاً سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ داعی گروہ میں وہ تمام افراد شامل ہوتے گئے جو آپ کی دعوت کے نتیجہ میں داخلِ اسلام ہوئے۔ مرد، عورت، بچے، جوان، غلام آزاد سب کی حیثیت داعی کی ہوتی تھی۔

☆ مکی زندگی میں مدعو اول اہلِ قریش اور اہلِ مکہ قرار پائے۔ جیسے جیسے دعوت عام ہوتی گئی اس کے اثرات اطراف و جوانب اور کبھی بعض دور دراز علاقوں تک بھی پہنچے۔ اولاً میدانِ دعوت بہت محدود تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ایک فطری رفتار سے اس میں وسعت آتی گئی۔ یہاں تک کی ۱۳ نبوی میں دعوتِ اسلامی سے متاثر ہو کر اہلِ مدینہ نے حضور ﷺ کو اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس طرح جستہ جستہ دیگر قبائل، آبادیوں، بلکہ ملکوں اور اربابِ حکومت تک اس دعوت کی سن گن پہنچ گئی۔

☆ طریقہ دعوت میں ذہنی اور فکری تسخیر اور ابہام و تفہیم کو اپنایا گیا۔ ابلاغ و ترسیل کے مروج حکمت طریقے اختیار کیے گئے۔ مخالفت اور ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل کی تلقین کی گئی۔ ظلم و ستم سہتے ہوئے یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ فریضہ دعوت انجام دینے کی ہدایت فرمائی گئی۔ ہتھیار اٹھانے یا بدلہ لینے سے سختی سے منع کر دیا گیا۔

☆ دعوتِ اسلامی کے نتیجہ میں نمایاں طور پر تین گروہ وجود میں آئے۔ (۱) آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے والے اہلِ اسلام (۲) آپ کی دعوت کی پر زور مخالفت کرنے والے اور اس دعوت کو ہر قیمت پر روک دینے کی مہم چلانے والے کفار و مشرکین (۳) عوام الناس، جو زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتے، سربرآوردہ لوگوں کے پیچھے چلنے والے، غیر شعوری طور پر رسم کہن سے وابستہ رہنے والے ہوتے ہیں۔

گروہ اول مخلص مسلمانوں کا تھا جو نہایت شعور کے ساتھ اسلام کو برحق تسلیم کر کے اس راستے کی ساری مشکلات کا اندازہ کرنے کے بعد نہایت جرأت و ہمت کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ پوری مکی زندگی میں ان کی تعداد بہت محدود تھی۔ بمشکل آبادی کا پانچ فیصد کہہ سکتے ہیں۔ گروہ ثانی جنہوں نے اسلام کا پیغام سنا، سمجھا اور نہایت شعور کے ساتھ اس کی مخالفت کا فیصلہ کیا اور مخالفت میں نہایت شدید رویہ اختیار کیا۔ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس گروہ میں آبادی کے دس فیصد افراد کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا گروہ جو ۸۵ فیصد افراد پر مشتمل تھا وہ گو کہ مخالفین کے ساتھ تھا مگر اس کی مخالفت شعوری نہ تھی۔ آباء پرستی، پرانی روایات سے لگاؤ، سرداروں کے مختلف نوعیت کے اثرات وغیرہ کے تحت مخالف کیمپ میں موجود تھا۔ ان کے اندر غور و فکر کر کے اچھے برے کی تمیز کے نتیجے میں قطعی فیصلہ کرنے کی قوت نہ تھی۔

جب تک بالادستی کفار کی تھی ان کی حمایت میں کھڑے تھے اور جیسے جیسے ان کی قوت ٹوٹتی گئی یہ طبقہ بھی دھیرے دھیرے ادھر سے ٹوٹ کر مسلمانوں کے ساتھ آتا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اسے خاموش تماشائی (Silent Majority) کہہ سکتے ہیں۔ تقریباً ہر تحریک کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔

دعوت کا موجودہ مرحلہ

اس پس منظر میں آج دنیائے دعوت کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ مرحلہ دورِ مکی کے پہلے یا بہت آگے بڑھیں تو دوسرے مرحلہ کی طرح ہے۔ نصف صدی قبل تک دنیائے انسانیت کے سامنے داعیانہ آداب کے ساتھ اسلام کے مثبت پیغام کو پہنچانے میں امتِ مسلمہ کے عوام و خواص کو بہت زیادہ شعور نہ تھا الا ماشاء اللہ۔ ماضی قریب کی تاریخ میں بعض مناظروں اور مباحثوں کے تذکرے ملتے ہیں مگر ان کی نوعیت اس دعوت کی نہ تھی جو حضور ﷺ نے مکہ کے ابتدائی دور میں شروع کی تھی۔ موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ کارِ دعوت کی وسعت کے نتیجے کے طور پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آج کی مخالفت کی بنیادیں کچھ دوسری ہیں البتہ جیسے جیسے شعوری دعوت کے میدان میں پیش رفت ہو رہی ہے اسی اعتبار سے مخالفت کا منہج بھی بدل رہا ہے۔

آج کے دور میں داعی کی حیثیت پوری ملت اسلامیہ کی ہے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر حقیقی مفہوم میں بھی لفظ داعی استعمال کریں تو بھی یہی بات درست ہوگی کیونکہ داعین کا طبقہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ البتہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس طرح مدعو اور میدان دعوت کو بھی محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جہاں داعی وہاں مدعو اور وہی میدان دعوت ہوگا۔ گویا ابتدائی دور نبوی میں جو مسلمانوں، کافروں کے الفاظ میں تخصیص یا محدودیت تھی آج کے کار دعوت میں اس طرح کی تخصیص اور محدودیت ممکن نہیں ہے۔

آج کار دعوت ایک آفاقی تحریک ہوگی۔ داعی مسلمانان عالم ہوں گے اور مدعو پوری دنیا کے انسانیت ہوگی۔ اور میدان دعوت پورا خطہ ارضی قرار پائے گا۔ دعوت کے موجودہ ابتدائی مرحلہ میں بھی جغرافیائی تحدید نہ فکری اعتبار سے ممکن ہے نہ عملی اعتبار سے۔ آج کوئی بھی تحریک یا دعوت محدودیت کے ساتھ اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچ سکتی ہے۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ آج گلوبلائزیشن اور ترسیلی ذرائع کی ہمہ گیریت نے اس حقیقت کو مزید مبرہن کر دیا ہے۔

ان حقائق کے ادراک کے بعد اجزاء دعوت کی مزید تنقیح ہونی چاہیے وہ یہ کہ:

(۱) آج کا داعی وہ ہے جو اسلام کی صداقت پر پورا یقین رکھتا ہے۔ جس کے اندر شہادت حق اور دعوت دین کا جذبہ ہے اور جو میدان دعوت میں سرگرم عمل ہے۔ اسے گروہ اول سے تعبیر کریں جس کی تعداد آج کل آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے۔

(۲) مدعوئین کے دو طبقات ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو اسلام کی اثر انداز ی سے واقف ہے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کو اپنے وجود و مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے احیاء میں اپنی موت دیکھتا ہے۔ یہ شعوری مخالفین کا طبقہ ہے جسے کافر کہا جاسکتا ہے۔ اس کی آبادی کا تناسب بھی ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔

(۳) دنیائے انسانیت کا ۹۸ فیصد حصہ اس تیسرے گروہ میں شامل ہے جو خاموش تماشائی (Silent Majority) کا ہے، جو حقائق کا ادراک نہیں رکھتا، جو مخالفین اسلام کی سازشوں کا شکار ہے اور اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈہ سے بے سوچے سمجھے متاثر ہے۔

دنیائے انسانیت کا دعوتی تجزیہ

اس پس منظر میں ہمیں پہلے کار دعوت کا جائزہ لینا ہے۔ اس کے بعد دعوت دین کے امکانات پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ جائزہ پہلے فکری و نظری طور پر لیا جائے گا اور اس کے بعد عملی دنیا کو سامنے رکھ کر تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

داعی گروہ: بلاشبہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے۔ اس عظیم تعداد میں اسلام کا سچا تصور رکھنے والے بیشتر وہ لوگ ہیں جو تحریکات اسلامی سے متاثر ہیں۔ عالمی سطح پر نمایاں تحریکات اسلامی میں اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ مسلم آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ اسی گروہ کے اندر گزشتہ چند سالوں سے غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کا شعور بیدار ہوا ہے۔ مگر یہ طبقہ بھی پوری طرح شعوری اور عملی داعی نہیں ہے۔ اخوان کے وہ عناصر جن کا تعلق خالص مسلم ممالک سے ہے وہ دعوتی شعور وعمل میں کافی پیچھے ہیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی کا وہ طبقہ جو مسلم اکثریتی ممالک سے وابستہ ہے ان کا حال بھی وہی ہے۔ لے دے کر تحریک اسلامی کے وہ عناصر رہ جاتے ہیں جو غیر مسلم اکثریتی ممالک سے وابستہ ہیں یا ترک وطن کر کے غیر مسلم اور کثیر ثقافتی ممالک میں اقامت گزیں ہیں۔ ان کے اندر دعوت دین کا کسی قدر شعور پایا جاتا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھئے تحریک کے وہ افراد جو ملازمتوں یا معاش کی غرض سے غیر مسلم اکثریتی ممالک میں قیام پذیر ہیں ان کی اکثریت بھی دعوتی شعور سے نابلد ہے۔ بلکہ مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ اب بھی ان کی پالیسیاں اور سرگرمیاں اپنے ممالک کی تحریکات کے زیر اثر بنتی ہیں۔ لہٰذا ان کے اندر وہ دعوتی روح موجود نظر نہیں آتی ہے جو مطلوب ہے مثلاً پاکستان یا عرب ممالک کے تحریکی افراد اب بھی پوری یکسوئی کے ساتھ امریکہ یا برطانیہ میں خود مختار، وہاں کے حالات کے پس منظر میں لائحہ عمل ترتیب دینے کے موقف میں نظر نہیں آتے حتیٰ کہ ہندوستان کے لوگ بھی سو فیصد دعوتی شعور کے حامل نہیں ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو عالمی سطح پر داعی گروہ کی تعداد بہت محدود ہو جاتی ہے۔ غالباً ایک فیصد کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔

سوویت یونین سے علحدہ ہونے والی ریاستوں کی مسلم آبادی اپنی شناخت کی بازیابی میں مصروف ہے۔ دعوت دین کا اسے بھی شعور نہیں ہے۔ اسی طرح چین کی مسلم آبادی دفاعی پوزیشن میں ہے۔ انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ میں تحریکی فکر بہت مضبوط نہیں ہے۔ وہاں بھی عمومی ماحول دعوت کا نہیں ہے البتہ دین سے وابستگی کی کیفیت ضرور ہے۔ برصغیر میں ہندستان اور شری لنکا کی تحریک اسلامی کو کسی قدر دعوت کا شعور ضرور ہے مگر عملی میدان میں اس کی کارکردگی بھی بہت نمایاں نہیں ہے۔ بنگلہ دیش، کشمیر، پاکستان کی تحریکات کا رخ سیاسی محاذ پر زیادہ ہے۔ افغانستان، عراق، خانہ جنگی کے دہانے پر ہیں۔ مشرق وسطی اور عرب ممالک کا عمومی ماحول دعوتی نہیں ہے۔ یہ خطہ اسلام مخالف قوتوں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں دعوت کا اطلاق عموماً مسلمانوں کی اصلاح اور تبلیغ و ارشاد پر کیا جاتا

ہے۔ افریقی ممالک کی کیفیت بھی اچھی نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہندوستان اور بعض دیگر ممالک کے تحریکی عناصر کے اندر کسی قدر دعوتی شعور موجود ہے اور ابتدائی مرحلہ میں دعوت دین کا فریضہ انجام بھی دے رہے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلمانانِ عالم کا دعوتی گراف اتنا پست ہے کہ اسے قابلِ ذکر نہیں کہا جا سکتا۔

گروہ مخالف: سیدھی بات یہ ہے کہ دعوت کے نتیجے کے طور پر جو مخالفت اٹھنی چاہیے، آج کے عالمی منظرنامے پر وہ مخالفت نہیں ہے۔ البتہ صیہونی لابی ضرور حفظِ ماتقدم کے طور پر یا اندرونی خبث کے نتیجہ میں سرگرم مخالفت میں پیش پیش ہے۔ ہندوستان کے مشرکین کا ایک محدود طبقہ بھی شعوری مخالفت میں سرگرم ہے۔ جہاں تک امریکہ اور برطانیہ کا معاملہ ہے دراصل ان کا خود کوئی کردار نہیں ہے بلکہ ایک طویل المیعاد منصوبہ کے تحت صیہونیوں نے ان ممالک کے اربابِ حل و عقد کو یرغمال بنا رکھا ہے اور وہ اپنے آقاؤں کے اشارہ چشم و ابرو پر اسلام اور مسلم دنیا کی مخالفت پر مجبور ہیں۔ گویا ان کی مخالفت شعوری نہیں جبری اور اعتقادی نہیں سیاسی ہے۔ البتہ یہ اور ان کے آقا یہود اتنے زور آور اور شاطر ضرور ہیں کہ آج پوری دنیا کو چار و ناچار ان کی ہاں میں ہاں ملانی پڑ رہی ہے۔ یہ ترسیلی ذرائع کو اختیار کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کر رہے ہیں۔ اپنی قوت کے بل بوتے پر پوری دنیا میں ایک دہشت کا ماحول بنا رکھا ہے۔ عوامی ضمیر بے بس ہے یا پھر ان کی آوازوں پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک جو دہشت گردی اور ظلم و بربریت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کم قصوروار ہیں۔ اگر جرائم کی منصوبہ بندی کرنے والا اصل مجرم ہے تو ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے اور منصوبہ میں رنگ بھرنے والے کم مجرم نہیں ہیں۔ عملاً انہیں کے ہاتھ مظلوموں کے خون سے رنگے ہوئے نظر آئیں گے۔

یہ صیہونی اور مشرکین جان بوجھ کر اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان پر دعوت کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ یہ اپنا کام کرتے رہیں گے۔ داعی گروہ کو ان کی پروا کیے بغیر اپنا فرضِ منصبی منصوبہ بند طریقے سے ادا کرنا چاہیے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ سرگرم مخالفین کی بھی عددی قوت بہت زیادہ نہیں ہے البتہ دیگر ذرائع سے انہوں نے خود کو مضبوط بنا رکھا ہے۔ مگر کارِ دعوت کی انجام دہی میں مشرکینِ مکہ کی طرح یہ دعوت رسانی کے عمل پر قدغن نہیں لگا سکتے۔ داعی کے پیچھے پڑ کر مدعو کو ورغلانے میں بہت کامیاب نہیں ہو سکتے۔

تیسرا طبقہ: دعوتی نقطۂ نظر سے موجودہ مرحلہ میں تیسرے طبقہ Silent Majority کا تناسب پوری انسانی آبادی کا تقریباً ۹۵ فیصد ہے۔ اس عدد پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ مجموعی آبادی کا ایک فیصد داعی گروہ میں شمار کیا جا سکتا ہے اور تقریباً یہی تعداد سرگرم مخالفین کی ہے۔ باقی پوری دنیا تیسرے طبقہ ہی میں تو ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم دنیا دونوں شامل ہے۔ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں عموماً تین کام انجام دینے ہوتے ہیں۔ (۱) دعوت کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا۔ (۲) دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا۔ (۳) دعوت قبول کرنے والوں کی تربیت کر کے انہیں فریضہ دعوت کی ادائیگی کے لیے تیار کرنا۔ لیکن اس تقسیم میں دورِ حاضر کے تناظر میں ایک شق کا اضافہ کرنا ہوگا۔ (۴) مسلم دنیا کو صحیح تصورِ اسلام سے واقف کرانا، انہیں حقیقی معنوں میں مسلمان بنانا اور فرضِ منصبی سے آشنا کرانا۔

پوری دنیائے انسانیت پر نظر ڈالیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم یا غیر مسلم دنیا صحیح تصورِ اسلام سے قطعی ناآشنا ہے۔ مسلمان نہیں جانتا کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ دین کا صحیح تصور کیا ہے۔ اسلام کے ان سے کیا مطالبات ہیں۔ اسلامی ترجیحات کیا ہیں۔ دعوتِ دین کسے کہتے ہیں۔ کارِ دعوت کیسے انجام دیا جائے۔ عوام کی ایک بھیڑ ہے جو نسلی اور موروثی طور پر دیگر اقوام و ملل کی مانند خود کو مسلمان کہتی ہے، اسلام سے لگاؤ رکھتی ہے، اسلامی روایات سے جذباتی طور پر وابستہ ہے اور بس۔ اسی طرح غیر مسلم دنیا بھی اسلام کو کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہے جتنا اور جیسا ذرائع ابلاغ مخالفانہ پروپیگنڈہ کے تحت بتاتے ہیں۔ وہ اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب تصور کرتی ہے۔ چند مظاہر اور علامتوں سے وابستگی کا نام اسلام دے دیا گیا ہے۔ وہ اسلام، قرآن، رسول، عقائد، عبادات، اسلامی طرزِ زندگی، اسلام کے اصول و مبادی سے قطعی نابلد ہے۔ اگر کہیں اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں آواز اٹھتی ہے تو وہ بھی غیر شعوری طور پر اور مخالفانہ کیمپ میں کوئی ملک یا گروہ سرگرم نظر آتا ہے وہ بھی بے سوچے سمجھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کے پیچھے بعض دیگر عوامل کارفرما ہیں۔

جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں جب کہ اسلامی تعلیمات کو بھی مختلف وسائل کے ذریعہ مشتہر کیا جا رہا ہے۔ مگر اکثریت اب بھی درست، نادرست، صحیح اور غلط کے درمیان تمیز سے عاری ہے کیونکہ جس قوت سے اہلِ اسلام دعوت پیش کر رہے ہیں اس سے کئی گنا قوت و وسائل استعمال کر کے اسلام کی تصویر کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ عوام ششدر ہیں آخر ماجرا کیا ہے۔ وہ کسے اسلام سمجھے۔ اب جس پروپیگنڈہ کا پلڑا بھاری ہوتا ہے ادھر ان کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔

مغربی ممالک کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ جدید ابلاغی ذرائع سے مستفید ہو کر حقیقت کی

معرفت حاصل کرنے میں کسی قدر کامیاب ہوں گے مگر وہاں کا اندرونی تجزیہ کیجئے تو صورت حال دیگر ممالک کے عوام سے بدتر ہے۔ یورپ اور امریکہ کے عوام کو اتنی فرصت نہیں کہ معاملہ کی تہہ میں جاسکیں۔ حقائق کی کھوج کرید کرسکیں۔ عام انسانی اقدار سے مالا مال ہونے کے باوجود حقائق شناسی کے اعتبار سے موہومات اور پروپیگنڈے کے موجودہ ماحول میں ان کی حیثیت طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی ذریعہ سے اگر حقائق ان پر منکشف ہوجائیں اور درمیان کے حائل دبیز پردے ہٹادیے جائیں تو بلاشبہ وہ اسلام کی حمایت میں آسکتے ہیں۔ مگر یہ کام ہو کیسے؟ یہی اصل مسئلہ ہے۔

منظر نامہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے

یہود اپنے وسیع منصوبے کے ایک ایک جزو پر قدم بہ قدم پیش قدمی کرتے ہوئے خود ساختہ منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ منصوبہ مستحکم بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے۔ بظاہر ان کا ایک ایک قدم حد درجہ مضبوط اٹھتا جارہا ہے۔ ظاہری اسباب کس مرحلہ پر کتنا توقف کے طالب ہیں، اس کے تجزیے میں غلطیاں ہوسکتی ہیں اور یہی غلطیاں بالآخر ان کی تباہی کا راستہ ہموار کریں گی۔

امریکہ بہادر اپنی طاقت وقوت کے نشے میں چور ہے، لیکن امریکہ فی نفسہ کچھ نہیں، اس کی حیثیت عالم واقعہ میں یہود کی پالیسیوں کو روبہ عمل لانے والے فرماں بردار غلام کی ہے۔ امریکہ کے ارباب اقتدار کی حیثیت پنجۂ یہود میں بے بس کردار کی ہے اور اس کی غلامی پر رضا کی وجہ یہ چالاکی ہے کہ بالآخر ایک مرحلہ میں اس پنجہ سے نجات مل جائے گی اور یہ احساس کہ پھر ہم اپنے پیروں پر خود مختار کھڑے ہوں گے۔

آج کے مرحلہ کی تیاریاں ایک صدی قبل سے جاری تھیں مگر چند ارباب نظر کے علاوہ دنیا میں وجود پذیر ہونے والے واقعات کو لوگ سطحی نظری سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اب کسی قدر نگاہوں میں وسعت آئی ہے مگر بہت سارے راز اب بھی سربستہ ہیں۔

گویا اب امریکہ ایک ایسی عالمی قوت ہے جس کا کوئی مد مقابل نہیں ہے اس کی پالیسیاں اتنی مستحکم ہیں کہ چاہنے کے باوجود دنیا کا کوئی فرد یا مملکت اسے چیلنج نہیں کرسکتا ہے۔ موجودہ مرحلہ میں امریکہ مشرق وسطی اور پوری دنیا کو تاراج کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی دلچسپی کا مرکز مشرق وسطی اور خلیجی ممالک ہیں کیوں کہ اس کے خفیہ آقا کا مفاد اور نصب العین اسی خطے سے وابستہ ہے، تاہم ان کے لیے دنیا کے دیگر ممالک کو اس مقام پر لانا ضروری ہے کہ ان کے ظلم وجبر کے خلاف کسی طرح کی کوئی آواز کہیں سے بلند نہ ہوسکے۔

آنے والے دنوں میں پورے شرق اوسط کے ہاتھ پاؤں کو اس طرح کس دیا جائے گا کہ وہ ذرا

بھی حرکت نہ کرسکے اور یہ بھی ضروری ہے اب تک باطنی کوششوں کو عملی شکل دیتے ہوئے سربراہان مملکت اور ان کے حواریین کو منظر نامے سے غائب کردیا جائے۔ عوام پر براہ راست تسلط کا وقت آگیا ہے۔ اب نہ صرف شرق اوسط بلکہ جہاں جہاں سے اس خطے میں کسی نوعیت کی مداخلت کا اندیشہ ہوسکتا ہے، ان سب کو بے بس کردینا ضروری ہوگیا ہے۔ ترتیب کار یہ ہے کہ شرق اوسط پر براہ راست اقتدار وتسلط قائم کیا جائے اور مکمل حمایت کرنے والوں پر بالواسطہ تسلط ہو یعنی یہ کہ اقتدار پر براہ راست تسلط کے بجائے بالواسطہ باقی رکھا جائے۔

براہ راست تسلط کے قیام کے بعد عوام ہوں گے اور بیچ پر امریکہ یہود کے مقرر کردہ ارباب اقتدار، مگر فی الواقع اس کے آقا یہود کے احکامات وفرامین زیر عمل لائے جائیں گے۔ جیسے جیسے یہود اپنی اگلی منزل کی طرف پیش قدمی کریں گے اسی نسبت سے عوام میں بیداری بلکہ جاں سپاری کی کیفیت پروان چڑھے گی مگر یہ بیداری عوام کے لیے بہت مہنگی پڑے گی۔ اب تک بعض نام نہاد وطنی حکمرانوں کے ذریعہ جبر کے سہارے عوام کو کنٹرول کرنے کا جو تجربہ کیا گیا ہے اسے مزید سختی سے دہرایا جائے گا مگر جوں جوں جبر کی بھٹی گرم ہوگی عوام کی بیداری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ان خطوں کے عوام واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہوجائیں گے۔ ایک طبقہ بظاہر عافیت کی طلب میں ارباب اقتدار کے آگے سپر ڈال دے گا بلکہ آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اپنے ہم مذہب اور ہم وطن لوگوں کے خلاف ان کے شانہ بہ شانہ ہوگا مگر اب عوام کے اس طبقے کو کسی جبر کے سہارے دبانا ممکن نہ ہوگا جو ایمان باللہ اور فلاح آخرت کی بنیاد پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے میدان میں سرگرم ہو چکا ہوگا۔

یہ کیفیت بالواسطہ زیر اقتدار سرزمینوں پر بھی ہوگی، یہاں بھی واضح طور پر دو طبقات ظہور پذیر ہوں گے۔ اب عالمی سطح پر جو کشمکش ہوگی وہ براہ راست حق وباطل یا بالفاظ دگر عیسی ودجال کے معرکہ کی ہوگی۔

موجودہ مرحلہ کا یہ منظر نامہ بڑا دلچسپ ہے۔ نزول عیسی تینوں مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اور اسلام) میں ایسی حقیقت ہے جس پر ہر گروہ کے اصحاب علم یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ ان کے لیے نجات کا ذریعہ ہوں گے اور تینوں نزول عیسی کے منتظر ہیں۔ مگر سب کی آرزوئیں ایک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے حد درجہ مغائر ہیں۔ یہودی حضرت عیسی کا انتظار اس لیے کررہے ہیں کہ ان کے ذریعہ ان کو اب تک کی ذلت وخواری سے نجات ملے گی اور خدا کی محبوبیت بحال ہوجائے گی۔ تقریبا دو ہزار سال کی نکبت کے بعد انہیں امید ہے کہ نزول عیسی کے بعد ان کا کھویا ہوا وقار بحال ہوگا اور دنیا پر مکمل حکمرانی ان کو حاصل ہوگی کیونکہ توریت کی پیشین گوئی میں حضرت عیسی کا

نزول۔ گرچہ یہ نزول حضرت عیسیٰ کی بعثت سے ہو چکا ہے مگر عیسیٰ مسیح کی تکذیب کے نتیجے میں ان کو ''حقیقی عیسیٰ'' کا اب بھی انتظار ہے جو مسیح دجال کی شکل میں ان کے درمیان ظاہر ہوگا۔

عیسائی حضرت عیسیٰ کے نزول کا انتظار اس پس منظر میں کر رہے ہیں کہ وہ ان کی امت سے ہیں اور جب پھر خداوند خدا کا بیٹا آئے گا تو اس کے ذریعہ پورے عالم پر بلا شرکت غیرے ان کا تسلط ہوگا، گویا ان کے خیال میں یہودیوں اور مسلمانوں کے خلاف حضرت عیسیٰ عیسائیوں کی قیادت کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی نزول عیسیٰ کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگے ہیں اور موجودہ مرحلہ میں اپنے دشمن یہودیوں کی حمایت اور بلا شرط تائید کا مقصد یہ ہے کہ اسرائیلی ریاست کا قیام اور اس کے سلسلے کی جملہ کاروائیاں نزول عیسیٰ کی علامات ہیں جو بائبل اور اناجیل میں پڑھتے ہیں۔ آج اپنے دشمن کی حمایت اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے نزول عیسیٰ کا راستہ ہموار ہوگا جو بہر حال یہودیوں کی حمایت نہیں کریں گے اور نہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ جب وہ مرحلہ آئے گا تو بالآخر پلڑا انصاری کا بھاری ہوگا کہ ان کے قائد حضرت عیسیٰ مسیح ہوں گے۔ مسلمان بھی حضرت عیسیٰ کے منتظر ہیں۔ ان کے انتظار کی بنیاد قرآنی نصوص اور علامات قیامت کے سلسلے میں وارد مستند احادیث ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جب ظلم و جور، شر و فساد، قتل و خون عام ہوگا تب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو جنہیں صلیب سے زندہ اٹھا لیا گیا تھا دوبارہ نازل فرمائے گا۔ وہ اس پر آشوب دور میں جب کہ دجال کا فتنہ عام ہوگا اور زمین شر و فساد سے بھر جائے گی، حضرت عیسیٰ اہل حق کے مسیحا بن کر نازل ہوں گے اور دجال کے شر سے انہیں بچائیں گے۔ دنیا میں حق کے پرچم کو سر بلند کریں گے اور دین محمدی کو جاری و ساری فرمائیں گے۔

ان آرزوں کے درمیان دست قدرت حرکت میں ہے۔ مشیت یزدی کا یہ منظر بہت عبرت ناک ہے۔ واقع ہونے والا واقع ہوگا مگر کس کے حق میں ہوگا، وقت بتائے گا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ مسیح کسی فرقے کا نجات دہندہ نہیں ہوگا وہ اہل حق کا قائد ہوگا اور ضروری نہیں کہ موجودہ مسلم ملت کل اہل حق میں سے ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ عیسائی کل کے کل مسیح موعود کے دشمن ہوں گے ان میں وہ لوگ اہل حق شمار ہوں گے جو یہودی سازشوں، امریکہ کے ظلم و جور اور قتل و غارت گری کے ماحول میں اللہ کی رضا کے لیے راہ حق پر گامزن ہوں گے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں شامل فرمائے۔ آمین

واقعاتی ترتیب

☆ یہود نے اپنے مکر و فریب سے عالمی سطح پر ایسا جال پھیلا دیا ہے کہ پوری دنیائے انسانیت ان کے پنجہ خونیں میں مجبور محض ہے۔

☆ کے بعد دیگرے مشرق وسطیٰ سے ممکنہ تمام مزاحم قوتوں کو توڑ دیا جائے گا۔ اسباب و وسائل پر مکمل تسلط حاصل کر لیا جائے گا۔ افغانستان، عراق سے شروع ہو کر پورے خطہ میں یہ عمل دوہرایا جائے گا۔

☆ پوری دنیا میں ان تمام قوتوں پر تسلط حاصل کر لیا جائے گا یا ان کی مزاحمتی قوت کو توڑ دیا جائے گا جس سے یہودی خود ساختہ منزل کی طرف پیش قدمی میں کسی نوعیت کی رکاوٹ کا اندیشہ ہو۔

☆ بیت المقدس کو مسمار کیا جائے گا تا کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر جدید کی جا سکے اور یروشلم کو مرکز بنایا جائے گا۔

☆ اس حادثہ فاجعہ پر عالم اسلام میں شدید رد عمل ہوگا، مسلمان اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ مرحلہ بیک وقت یہود کے لیے عظیم تر اسرائیل کے سرحدوں کی تعیین کے لیے سازگار ہوگا اور مزاحمت کی سرکوبی یا دفاع کے نام پر مدینہ کا محاصرہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی خود ساختہ سرحدیں مدینہ تک بسیط ہیں۔

☆ مگر ساری احتیاطی تدابیر مسلم ملت کی بیداری کے سامنے بے سود ہوں گی اور زبردست خوں ریزی ہوگی، مسلمانوں کا ایک طبقہ منافقت اختیار کرے گا اور دشمنان اسلام سے تحفظ کے لیے اپنے ایمان کا سودا کر کے ہمیشہ ہمیش کی جہنم کا مستحق ہوگا۔ دوسرا طبقہ راہ حق میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگا۔ ایک طبقہ غازی ہوگا اور اقدام جاری رکھے گا۔

☆ مسیح دجال نمودار ہوگا، اور اہل حق کی سرکوبی کے لیے دجل و فریب کا آخری حربہ استعمال کیا جائے گا۔

☆ مسیح موعود اتارے جائیں گے اور ان کی قیادت میں ان شاء اللہ اہل حق کو فتح و نصرت نصیب ہوگی۔

خلاصۂ بحث

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اس نے اپنی معزز کتاب میں قیامت تک رونما ہونے والے حالات کا نہ صرف ذکر فرمایا ہے بلکہ حالات و واقعات کے پس منظر میں کیا انداز فکر اختیار کیا جائے اس جانب بھی واضح نشان دہی فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''لتجدن اشد الناس عداوۃً للذین آمنوا الیھود والذین اشرکوا. ولتجدن اقربھم مودۃً للذین آمنوا الذین قالوا انا نصاری. ذالک بان منھم قسیسین و رھبانا وانھم لا یستکبرون. واذا سمعوا ما

انزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق۔ یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاھدین (المائدہ: ۸۲، ۸۳)

”تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود و مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کی دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں۔ اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام ایمان لانے والوں میں لکھ لے“

ان آیات سے چند حقائق مبرہن ہو جاتے ہیں۔ (۱) اہل ایمان کے دشمن نمبر ایک یہود ہیں۔ (۲) اور اس صف میں مشرکین بھی ہیں۔ (۳) مومنین سے زیادہ قریب نصاریٰ ہیں کیونکہ ان کے اندر کبر و نخوت کا مرض نہیں ہے۔ (۴) کلام الٰہی سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ (۵) عرفان حق کے بعد وہ گواہی دینے والوں میں شامل ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔

یہود سے مراد پوری قوم یہود نہیں بلکہ ان کی غالب اکثریت ہے۔ یہودیت اور صیہونیت ایک مخصوص ذہنیت ہے۔ بعض اہل یہود اس کلیہ سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرکین سے مراد تمام مشرک افراد نہیں ہیں بلکہ مشرکین کے سرغنہ یا برہمنی ذہنیت کے حامل مشرکین ہیں جو چالاکی اور عیاری کے ساتھ عوام کو اپنی فریب کے جال میں پھنسائے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ سے مراد پوری قوم نصاریٰ نہیں بلکہ ان کا وہ طبقہ ہے جس کے اندر کسی درجہ میں حق پسندی للّٰہیت اور قلبی گداز ہے۔ نصاریٰ پر اثر انداز ہونے والی چیز کلام الٰہی یا قرآن کریم کی راست تعلیم و تلقین ہے اور قبولیت حق کے بعد یہ لوگ شہداء علی الناس کے مقام بلند پر پہنچیں گے کیونکہ ان کے اندر اس کی خواہش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: منھم امۃ مقتصدۃ و کثیر منھم ساء ما یعملون (مائدہ: ۲۶) ”اگرچہ ان میں کچھ راست رو ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔“

امر واقعہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر جو انسانی طبقہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی اور بیخ کنی میں سب سے آگے اور منظم ہے وہ یہودی ہیں۔ انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے دنیائے انسانیت کو اپنی فریب کاریوں کے جال میں سختی سے جکڑ رکھا ہے۔ دنیا کی وہ طاقتیں جو غیر یہود ہیں وہ اسلام دشمنی کا واضح قائدانہ رول ادا کر رہی ہیں ان کی حیثیت یہودیوں کے زرخرید غلام یا بے بصیرت روبوٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی یا دیگر ممالک سب کی نکیل پنجہ یہود میں ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس حکمت عملی سے وہ یہ فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں کہ

براہ راست اہل اسلام کی زد میں آنے کے بجائے اپنے دو دشمنوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دونوں کی قوت کو پامال کر کے عالمی بالادستی کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

یہ اجمال تفصیل کا طالب ہے لیکن اہل بصیرت جن کی نظر عالمی بساط پر ہے وہ بآسانی پوری تفصیل سمجھ سکتے ہیں۔ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو عالمی سطح پر مسلم دشمنی کی چھوٹی بڑی تمام سرگرمیوں کے پس پردہ صیہونی سازش کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ مسلم دشمنی میں بہر حال یہود کو بالادستی حاصل ہے۔ وہ واحد ایجنڈا اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے تحت سرگرم جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ یہودیوں کی حکمت عملی کی کامیابی ہے کہ بیشتر مسلم دنیا اپنے ایجنڈے پر یہودیوں کو رکھنے کے بجائے کچھ دوسرے لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے اور بسا اوقات مذکورہ حقائق کی ترجمانی کو ذہنی المجھن لیا تصور کرتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

نزول قرآن کے وقت والذین اشرکوا سے بطور خاص مشرکین عرب و عجم سمجھے جاتے تھے۔ ممکن ہے لوگوں کی نظر برصغیر کی طرف نہ ہو حالانکہ مختلف اسباب کی بنا پر مشرکین کا ایک زیرک طبقہ وسطی ایشیاء سے ترک وطن کر کے ہندوستان کو اپنی حیلہ سازیوں کے ذریعہ اپنا وطن بنا چکا تھا اور اس نے نہایت عیاری کے ساتھ یہاں کی اصل آبادی کو فنا کر دیا تھا یا غلامی کی فکری و عملی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔

اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہودیوں کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں مشرکین ہند سے ملتے نظر آئیں گے۔ بہر حال یہ دوسرے نمبر کا دشمن پہلے نمبر کے دشمن کے ماتحت مخالفانہ سرگرمیاں انجام دے رہا ہے اور اسی انداز کی دشمنی رکھتا ہے جس طرح یہود رکھتے ہیں۔ یہاں بھی وضاحت ضروری ہے کہ برہمنیت ایک سوچ کا نام ہے جس کی بردار قوم کی غالب اکثریت علم بردار ہے ورنہ اس طبقہ میں بھی نیک نفوس ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

اس برہمنیت کی پالیسیوں اور ان کے منصوبوں کے اثرات دوسرے درجہ میں عالمی سطح پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ دنیا کے وہ مذاہب یا طبقات جو خالص اسی برہمنی سازش کا شکار ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں فروکش ہوئیں وہ خواہی نخواہی اپنے وجود ان کی فکری غلامی یا سازش کے تحت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی ہمیشہ دو دشمنوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے خود کو محفوظ رکھا ہے اور نشانہ سے بچتے رہے ہیں۔ آج بھی انہوں نے اپنے اردگرد مختلف آہنی ڈھال بنا رکھے ہیں مگر اہل بصیرت اس دشمن قوت سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

عالمی سطح پر تیسرا موثر اور بڑا طبقہ عیسائیوں کا ہے۔ عیسائیت اور عیسائیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہاں شاطرانہ اور انسانیت کے لیے مجرمانہ سازشوں کے حوالے کم ہی ملیں گے۔ البتہ ان کا تصور یہ

ضرور ہے کہ ہمیشہ سازشوں کا شکار ہو کر اسلام اور مسلم دشمنی کے رویہ پر عمل کرتی رہی ہیں۔ دور نبوی ﷺ سے لے کر صلیبی جنگوں کی تاریخ اور آج کا عالمی منظر نامہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ آج بھی اسلام مخالف کیمپ میں یہی تین نمایاں قوتیں سرگرم عمل ہیں۔

گروہ مخالف کے لیے حکمت عملی

یہودیوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "ضربت علیهم الذلة این ما ثقفوا الا بحبل من الله و حبل من الناس (آل عمران ۱۱۲) : وہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی۔ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یعنی ان کے وجود و بقا کا دارومدار اللہ کی نصرت و حمایت پر ہے یا پھر لوگوں کی تائید و حمایت سے وہ باقی رہ سکتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کی رسی سے وابستگی کا معاملہ ہے تو اسے انہوں نے ایسا توڑ دیا ہے کہ اس سے وابستہ ہونے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ لیکن حبل من الناس کو اتنا مضبوط پکڑ رکھا ہے اور اتنی مضبوطی سے اس حکمت پر عمل پیرا ہیں کہ بظاہر اس کے ٹوٹنے کی شکل بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن ان مخالفین یعنی یہودی قوت کا راز بہر حال حبل من الناس ہی میں ہے اور یہ الناس اصلاً اللہ کی امانت ہیں۔ اہل اسلام کو انہیں "الناس" کے لیے برپا کیا گیا۔ کنتم خیر امة اخرجت للناس ۔ تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں کی خیر و فلاح کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ یہودیوں کی قوت توڑنے کا واضح لائحہ عمل یہی ہے کہ جن "الناس" کو اپنے دام فریب میں لے کر اپنا مذموم مقصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں اس گروہ انسانی کو ان سے توڑ دیا جائے۔ ان سے ان کا Audience چھین لیا جائے۔ گویا ان لوگوں کو یہودیوں کی غلامی سے آزاد کرا کے اللہ کی غلامی میں لے آیا جائے۔ یہی کار دعوت ہے اور یہی دنیوی و اخروی نجات و عافیت کا راستہ ہے۔

تیسرا گروہ: اسلام پسندوں کا ہدف یہی تیسرا گروہ ہونا چاہیے جو ظاہر ہے پوری عیسائی دنیا۔ مشرکین کا عام طبقہ، دنیا کے پس ماندہ اور سازشوں کا شکار، کچلے پسے لوگ۔ لامذہب طبقات اور وہ سارے افراد اس گروہ میں شامل ہیں جو طبقہ یہود اور طبقہ مشرکین جن کی تشریح اوپر گزر چکی ہے ان میں نہیں آتے ہیں۔

دعوت دین کے امکانات

عصر حاضر کے اس تفصیلی دعوتی تجزیہ کے بعد دعوت دین کے امکانات پر گفتگو کرنا آسان ہوگا۔ بطور مثال یوں سمجھا جائے کہ دنیائے انسانیت ایک تختہ سیاہ ہے جس پر اسلام کی تصویر مرتسم کرنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت گری کے کیا امکانات ہیں؟

انسانی اذہان و قلوب سادہ نہیں ہوتے ان پر پیدائش سے موت تک کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہتا ہے۔ "کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه." اب دیکھنا ہے کہ انسانیت کے تیسرے طبقہ کے ذہن و دماغ پر کیا لکھا ہے اور جو لکھا ہے اس کا نقش کتنا گہرا ہے۔ یہ نقوش کیسے مٹائے جائیں اور ان پر پھر کیسے اسلام کی تصویر رقم کی جائے۔

داعی گروہ کو حالات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے مضبوط منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ مگر اپنی صفوں کی ترتیب و تنظیم کس نہج پر کی جائے اور اپنا کام انجام دینے کے لیے کس تیاری کے ساتھ، کس طریقہ سے کام انجام دیا جائے؟۔ یہ غور و فکر اور لائحہ عمل کی ترتیب کا دوسرا اہم نکتہ ہے۔ رہ گیا طبقہ مخالف تو وہ زیادہ موضوع بحث نہیں ہے کیونکہ اس کی مخالفت شعوری ہے وہ اپنی مخالفت سے باز نہیں آئے گا الا ماشاء اللہ۔ البتہ عوام الناس کے سامنے اس کے سیاہ کارناموں اور انسانیت سوز حرکات و عزائم کا پردہ ضرور فاش کرنا ہوگا۔ یہ دعوتی حکمت عملی کا تیسرا اہم باب ہے۔ جیسے دور محمدی میں تفصیل کے ساتھ اس وقت بنی اسرائیل کے جرائم عوام کے سامنے مختلف پیرایوں میں بیان کیے گئے تاکہ ان کا طلسم ٹوٹے۔ اعتماد مجروح ہو ان کے چنگل سے انسانیت آزاد ہو۔

پھر تیسرے طبقہ کے لوح ذہن کے نقوش کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا اور ان نقوش کو محو کرنے کی منصوبہ بند جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس طبقہ کے لوح پر جو بھی نقوش ہیں ان کا مٹانا مشکل کام نہیں کیونکہ فرمان خداوندی ہے "الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء تؤتی اکلها کل حین باذن ربها، یضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون ۔ مثل کلمة خبیثة کشجرة خبیثة اجتثت من فوق الارض ما لها من قرار. یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة ویضل الله الظالمین و یفعل ما یشاء (ابراهیم : ۲۴-۲۷)

لوح انسانی کی تطہیر کا ایک کامیاب نسخہ خود اللہ رب العزت نے تجویز فرمایا ہے۔ وقل جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل کان زهوقا. گویا حق رسانی ہی تطہیر اذہان و قلوب کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے کیونکہ تاریکی دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ روشنی کر دی جائے۔

اسی طرح ذہن سازی اور اسلام کی تصویر کشی کی منصوبہ بندی کا رخ دعوت دین ہی قرار پائے گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ دعوت دین کے امکانات حد درجہ روشن ہیں۔ دنیائے انسانیت مضطرب ہے۔ وہ باطل افکار و نظریات اور عالمی ٹھیکیداروں کی ریشہ دوانیوں سے کراہ رہی ہے۔ وہ حد درجہ دکھی ہے تکرا کے کہیں سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی ہے۔ اسلام کے سپیدہ سحر پر مصنوعی اور جھوٹے گرد و غبار اور سیاہ

دھوئیں کے مرغولے چھوڑ کر عوام کی نظروں سے اسے اوجھل کیا جا رہا ہے۔ وہ بار بار آنکھیں مل کر روشنی کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں مگر روشنی کی کرن اتنی کمزور ہے کہ لوگوں کی آنکھوں تک نہیں پہنچ پا رہی ہے۔ اگر چراغ کی لو تھوڑی اور بڑھا دی جائے اور درمیان میں حائل دھند اور گرد و غبار کو چھانٹ دیا جائے، اور انسانیت کی نگاہ تیز کر دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام صراط مستقیم پر دن کے اجالے میں تیز رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے منزل تصور کو نہ پالیں۔

دعوت دین کے نظری و فکری امکانات پر گفتگو سمیٹتے ہوئے تھوڑی روشنی عملی امکانات پر ڈالنا مناسب ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ باوجود شدید مخالفت کے اسلام کا پیغام حق تیسرے طبقے کے ذہن و فکر کو مسلسل جھنجھوڑ رہا ہے اور عالمی سطح پر ایک قابل ذکر تعداد روزانہ حلقہ بگوش اسلام ہو رہی ہے۔ اخبار بین حضرات سے دنیا کے تمام خطوں میں قبولیت اسلام کے واقعات پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ واقعات دعوت دین کے عملی امکانات کے بین ثبوت ہیں البتہ چند امور کی طرف توجہ مناسب ہے۔

(۱) قبولیت حق میں موجودہ رفتار خالص اللہ کا فضل ہے ورنہ دعوتی کاموں کے تناسب میں یہ نتیجہ سامنے نہیں آسکتا ہے۔ جس مقدار اور رفتار سے اہل حق کی کوششیں ہیں، اس کا کئی گنا زیادہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ یہ سراسر داعی گروہ کی کوششوں کی اللہ کی طرف سے قدر دانی اور نتائج کو اضعافاً مضاعفاً کی سنت کے تحت بڑھانے کا نتیجہ ہے۔

(۲) دشمنان اسلام تو اسلام کی تصویر مسخ کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں مگر اس شر سے اللہ تعالیٰ خیر کے پہلو نکالتا ہے۔ انهم یکیدون کیداً و اکید کیداً

صورت حال یہ ہے کہ تیسرے طبقے کے کان اس وقت کھڑے ہو جاتے ہیں جب اسلام ایک مہیب شکل میں ان کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس پر ان کا تجسس بڑھتا ہے، وہ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں اور سمجھنے کے لیے ممکنہ تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں اور پھر بفضل اللہ اسلام کے جام شیریں سے سیراب ہو جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے اچھی ترجمانی کی ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

(۳) اسلام کی فی نفسہ روشن اور دلربا تصویر کا کمال ہے کہ کسی کے ذہن و دماغ میں ہلکا سا رجحان اس کے لیے پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ تصویر خود نگاہوں میں رچ بس جاتی ہے اور کسی بھی نظر سے دیکھنے والا اس کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اللہ نور السموات

والارض مثل نوره کمشکوة فیها مصباح. المصباح فی زجاجة. الزجاجة کانها کوکب دری یوقد من شجرة مبارکة زیتونة لا شرقیة ولا غربیة یکاد زیتها یضیء ولو لم تمسسه نار. نور علی نور یهدی الله لنوره من یشاء و یضرب الله الامثال للناس. والله بکل شیء علیم
(النور: ۳۵)

دعوت کا لائحہ عمل

کسی بھی کام کی بہتر انجام دہی کے لیے منصوبہ بندی حد درجہ ضروری ہے۔ منصوبہ سازی میں جتنی باریکی اور حقیقت پسندی سے کام لیا جائے گا اتنا ہی بہتر نتیجہ سامنے آئے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ کام کی نوعیت و اہمیت کے پیش نظر میدان دعوت کی منصوبہ بندی بے توجہی کا شکار ہے یا کما حقہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ ذیل کی تفصیلات سے ایک اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **آفاقیت:** عصر حاضر میں دعوت دین ایک عالمی عمل ہے چونکہ داعی گروہ بھی عالمی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ مدعوئین بھی تمام انحائے عالم میں موجود ہیں اور میدان دعوت بھی پوری دنیا ہے لہذا دعوت دین کا لائحہ عمل بھی عالمی ہونا چاہیے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جن افراد، اداروں یا تنظیموں کو اس فرضیت کا احساس ہے وہ اپنی سطح یا اپنے دائرہ عمل میں رہ کر منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ایک حد تک یہ طریقہ بھی درست ہے مگر اصلاً درست نہیں ہے کیونکہ:

اول یہ کہ دعوت دین کے مخالف طبقہ کی لام بندی عالمی سطح کی ہے۔ اس نے دعوتی محاذ کو دبانے کی طویل المیعاد منصوبہ بندی عالمی سطح پر کر رکھی ہے۔ ظاہر ہے دشمن قوت کی جد و جہد جس سطح کی ہوگی اسی سطح سے اقدام و حمایت کی کوشش بھی ہونی چاہیے ورنہ مثبت انداز سے کار دعوت کی نہ صرف یہ کہ توسیع ممکن ہو سکے گی بلکہ اکثر محاذ پر میدان خالی رہے گا۔

دوم یہ کہ آج دنیا کا کوئی بھی چھوٹا بڑا عمل جغرافیائی حدود میں محدود نہیں ہے اور نہ رہ سکتا ہے۔ پھر اس روئے زمین کا اہم ترین منصوبہ کیسے زمینی حدود کا پابند ہو سکتا ہے۔ لہذا لامحالہ کار دعوت کی منصوبہ بندی عالمی سطح سے ہونی چاہیے اور پھر اس عظیم منصوبہ بندی کے تحت ممالک، تنظیموں، اداروں اور افراد کو اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر منصوبہ بند کوشش کرنی چاہیے۔

گویا بات یہ بنتی نظر آتی ہے کہ محدود منصوبہ بندیاں مل کر عظیم منصوبہ بندی کو جنم دیں اور پھر عظیم منصوبہ کے زیر سایہ محدود منصوبے تشکیل دیے جائیں اور ایک عالمی اسٹریٹجی کے تحت ہر جگہ عملی سرگرمیاں انجام دی جائیں۔

عالمگیریت کے اس دور میں کسی بھی ملک کی تحریک اسلامی، داعی فرد یا گروہ کی طرف سے میدانِ دعوت میں سرگرم افراد، اداروں اور تنظیموں کی کانفرنس بلانا مشکل کام نہیں ہے۔ اگر اس میں بے علتی نظر آئے تو غیر اعلان شدہ اسلامی اجتماعات حج و عمرہ وغیرہ کے ذریعہ یہ نشست ہو سکتی ہے۔ اس کانفرنس کے ذریعہ عالمی لائحہ عمل پر غور و فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اصحاب حل و عقد بہتر انداز سے اس ایجنڈے پر مناسب رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک تجویز یہ ہے کہ داعی گروہ کی تشخیص کی جائے۔ اس طبقہ کی توسیع اور وسائل کی فراہمی کے لیے منصوبہ سازی ہو۔ اس میں فکری، علمی، نشریاتی، مالی میدانوں میں معاونین کو نشان زد کرکے ممکنہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلامی شعور رکھنے والے افراد خواہ ان کا تعلق مسلم ممالک سے ہو یا غیر مسلم ممالک سے، ان کے طرزِ فکر کو آفاقی رخ دے کر انہیں اپنی پالیسیوں میں دعوتی ترجیحات قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے اور مخالفت کی قوت کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اصل مخاطبین تیسرے طبقہ کی حقیقت پسندانہ انداز میں نشاندہی کی جائے۔ جذباتی بنیادوں پر ملکوں اور گروہوں کی مخالفت سے اجتناب کیا جائے۔ جو فی الواقع کافر ہیں ان کی تعیین کے بعد عوام الناس کو اپنا میدانِ کار بنایا جائے اور پھر اس میدان میں نفوذ کے لیے موثر تدابیر اختیار کی جائیں۔ دعوتی محاذ پر جد و جہد کے لیے مسلم اہل خیر اور ارباب اقتدار سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار کام کا آغاز ہو جانے کے بعد امید کی جانی چاہیے کہ اللہ کی تائید و نصرت سے آگے کے مراحل مزید روشن ہوتے چلے جائیں گے اور داعیانہ تڑپ رکھنے والوں کی اجتماعی کوششوں سے بہتر نتائج بہت جلد برآمد ہونے لگیں گے۔ اس تجویز کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ دورِ حاضر میں ملکوں کی سطح پر ہونے والی کوششوں کی ناقدری کی جائے بلکہ یہی تو اصل ہیں جن پر عالمی لائحہ عمل کی تنظیم ہونی ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی پالیسیوں میں کہیں ٹکراؤ بھی نظر نہیں آتا بلکہ یک گونہ تعاون و اشتراک اور پشت پناہی کی امید کی جانی چاہیے۔

(۴) دعوتی افکار کی تشکیل: فریضۂ دعوتِ دین کسی ذہن کی اپج نہیں ہے بلکہ فرمانِ الٰہی کے تحت پوری امت پر قیامت تک کے لیے یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے اسلام کی دیگر بنیادی تعلیمات کی مانند یہ فریضہ بھی یا تو ذہنوں سے اوجھل ہو گیا ہے یا اس کا درست رخ متعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ تحریک اسلامی ہند نے اس حقیقت کا ادراک آزادی کے وقت ہی کر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ شعوری اور منصوبہ بند کوششوں کا سلسلہ ماضی قریب میں شروع ہو سکا ہے۔ اور اب بھی مختلف النوع تجربات کی بنا پر ان کوششوں میں موجود کوتاہیوں اور کمیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

بالفاظ دیگر اتنی طویل مدت گزرنے اور ہر جہت سے کوشش کرنے اور کافی دنوں سے اپنی ترجیحات میں شامل کرنے کے باوجود تحریک اسلامی ہند مکمل طور پر Dawah Oriented نہیں بن سکی ہے۔ جب ہندوستان جہاں تحریک کا میدان کار ہی غیر مسلم برادرانِ وطن ہیں، اس کا یہ حال ہے تو بھلا وہ ممالک جہاں غیر مسلم نہیں ہیں ان کا دعوتی رخ و مزاج کیسے بن سکتا ہے؟! اب اگر مسلم ممالک کی تحریکات آفاقی نقطۂ نظر سے اپنی پالیسیاں ترتیب دیں اور جغرافیائی حدود میں مقید ہو کر اسلام کا مستقبل نہ دیکھیں تو ممکن ہے رفتہ رفتہ وابستگانِ تحریک کے افکار و اذہان دعوت کی حقیقت سمجھ کر اس نہج پر کام شروع کر سکیں۔ مگر اس کے لیے مسلسل ذہنی تربیت کرنے اور فکری غذا فراہم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تحریکاتِ اسلامی کی بڑی قوت مسلم ممالک سے وابستہ ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی لا کر دعوتی بنانا عصرِ حاضر کا اہم ترین تقاضا ہے۔

تحریکات کو اپنے ممالک کے لیے دیگر ضروری پالیسیوں کے ساتھ اس نقطے کو شامل کرنا چاہیے۔ بطورِ خاص ان تحریکات کے وہ افراد جو غیر مسلم اکثریتی ممالک میں قیام پذیر ہیں۔ انہیں واضح ہدایت دینی چاہیے کہ اپنی پالیسیاں خالص ان ممالک کے حالات کے پس منظر میں تشکیل دیں جہاں وہ مقیم ہیں اور یکسوئی کے ساتھ دعوتی کام انجام دیں۔ ان قوتوں کو متاثر کرنا یا اپنی پالیسیوں کے ماتحت رکھنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔

(۳) دعاۃ کی تربیت و تیاری: بلاشبہ پچھلی دو دہائیوں سے مختلف سطحوں پر دعاۃ کی تیاری کی بات سننے میں آتی رہتی ہے مگر امرِ واقعہ ہے کہ اس جانب ابھی بالکل ابتدائی پیش رفت ہی ہو سکی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ عالمی یا ملکی سطح پر مدعو کے احوال و ظروف، تہذیب و ثقافت اور زبان و بیان میں دعوت پیش کرنے والے افراد نظر نہیں آتے۔ جب تحریک اسلامی ہند کا یہ حال ہے تو دیگر ممالک کی تحریکات کا کیا حال ہوگا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غالباً دعاۃ کی تیاری کا لفظ اچھا تو لگتا ہے مگر اب بھی حالات کی نزاکت کا بخوبی اندازہ نہ ہونے اور دعوت کے ارد گرد حائل دبیز پردوں کے سبب شرحِ صدر کی دولت میسر نہ آ سکی ہے ورنہ یہ کام بڑے پیمانے پر بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

تاہم پہلی فرصت میں اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دعاۃ کی ہمہ جہتی تربیت و تیاری میں جہاں ملکی مطالبات و ضروریات کا لحاظ رکھا جائے وہیں بین الاقوامی ضروریات کو ہرگز نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے عالمی مطالبات زیادہ اہم محسوس ہوتے ہیں۔ دعاۃ کی تیاری کی ضرورت محسوس کرنے والے افراد اور تنظیموں کی وسعتِ نظری، بلند ہمتی اور آفاقی نقطۂ نظر ہی سے یہ ممکن ہے کہ عالمی سطح پر دعاۃ کا جو خلا ہے رفتہ رفتہ پر کیا جا سکے۔

اللہ کی طرف بندگان خدا کو بلانا براہ راست اللہ کی نصرت ہے لہذا اس کی ذات سے پوری امید رکھنی چاہیے کہ اس کام میں آج کے مادی دور کے تقاضے حارج نہیں ہوں گے۔ ایسے افراد کو عالمی سطح پر آسانیاں میسر آئیں گی کیونکہ ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم کا وعدہ برحق ہے۔

اعداد الدعاۃ کا یہ کام غیر مسلم اکثریتی ممالک میں بھی انجام دیا جانا چاہیے اور خالص مسلم ممالک میں بھی اس کا نظم ہونا چاہیے اور اس کام پر اپنے وسائل کا خطیر حصہ خرچ کرنا چاہیے۔

اعداد الدعاۃ کی مختلف سطحیں ہیں اور ہر سطح کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ ماہرین کی ٹیم کے ذریعہ اس کا پورا منصوبہ بننا چاہیے اور عمومی، خصوصی، علمی، عملی، ابلاغی، سیاسی، معاشرتی و معاشی وغیرہ مختلف سطحوں سے یہ کام انجام دینا چاہیے۔

اعداد الدعاۃ کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں ابتدائی ضروریات کو ایک جامعیت کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خاکہ میں پیش نظر ملت اسلامیہ کے وہ نوجوان ہیں جو دینی مدارس سے عالمیت کی تکمیل کر چکے ہیں یا عصری درسگاہوں کے وہ طلبہ ہیں جو انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم کے کسی ایک شعبہ کا انتخاب کرتے ہیں۔

(۴) رائے عامہ کی استواری: الحمدللہ تحریکات اسلامی کو حق کے محاذ پر رہنمایانہ اور قائدانہ مقام حاصل ہے۔ اس مقام کے تقاضے کے تحت اپنے منصوبوں کو زیر عمل لانے کے لیے تحریکات کو مسلم رائے عامہ کو ساتھ لینا چاہیے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے صراط مستقیم کی ہدایت فرمائی۔ اب اگر کچھ لوگ مطلوبہ سطح سے نہ سہی تھوڑا بہت جذباتی لگاؤ ان کاموں سے رکھتے ہیں جو مطلوب ہیں تو خذ ما صفا ودع ما کدر کی حکمت عملی کے تحت کسی طرح سے ان کی مثبت کوششوں کو مربوط کر کے مطلوبہ مقصد کے حصول میں استعمال کیا جائے۔

قرآن وسنت کی غیر مبہم ہدایات کی بنا پر مسلم عوام و خواص میں دعوت دین کا کسی درجہ میں احساس و شعور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے حقیقی کے بجائے سطحی مفہوم میں سمجھتے ہیں۔ اس کا اطلاق دوسرے غیر مطلوب انداز سے کرتے ہیں۔ مگر فی نفسہ دعوت دین کا جذبہ قابل قدر ہے اور اس کی قدر دانی ہونی چاہیے۔ ملکی اور عالمی سطح پر مختلف افراد، ادارے، انجمنیں، تنظیمیں بلکہ بعض ممالک بھی اس سلسلے میں اپنے اپنے انداز سے انسانی و مادی وسائل کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان سب کا جائزہ لے کر حکمت کے ساتھ ان کوششوں کو بامعنی بنانا اور حقیقی معنوں میں دعوتی رخ دینا یہ تحریکات اسلامی کا اہم کام ہے۔

اس طرح جو افراد، ادارے اور ممالک کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں مگر تھوڑی کوشش سے اس جانب

متوجہ ہو سکتے ہیں ان کی حمایت حاصل کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہونی چاہیے۔

بسا اوقات تحریکات کا ذہنی سانچہ ایسا بن جاتا ہے کہ اپنے خود ساختہ معیار کے علاوہ ہر عمل کو ناکارہ یا بے کار تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہ ذہنی تنگی تحریکات کے فروغ اور مثبت نتائج کے حصول میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے اگر پامال کر دیا جائے تو مادی اور معنوی اعتبار سے زبردست طاقت مجتمع کی جا سکتی ہے۔

ان بنیادی باتوں کی روشنی میں ہر سطح پر ایسا لائحہ عمل ترتیب دینا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ مسلم عوام و خواص کا ہمہ جہتی تعاون حاصل ہو۔ اخلاقی حمایت بھی بہت قابل قدر سرمایہ ہے۔ مسلم ممالک کے اہل ثروت یا حکمراں طبقہ سے اس باب میں حمایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طرح حکومتوں اور تحریکات کے درمیان دوریاں بھی کسی قدر کم ہو سکتی ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس کار خیر کے طفیل دنیوی و اخروی بہت فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

(۵) یقینی پیغام رسانی: سنت نبوی میں دعوتی روابط کی مختلف نظیریں ملتی ہیں مثلاً کوہ صفا کے ذریعہ دعوت عام۔ دسترخوان پر بلا کر دردمندی سے پیغام حق پہنچانا۔ وفود وقبائل سے اجتماعی گفتگو۔ سرداروں و بادشاہوں کو خطوط نویسی۔ فرداً فرداً لوگوں سے ملاقاتیں۔ عوامی خدمات کے ذریعہ قریب کرنا۔ خانہ کعبہ میں اعلان توحید وغیرہ۔ اللہ کا شکر ہے عصر حاضر کے داعین ممکنہ تمام معروف ذرائع اختیار کرتے ہوئے اسلام کا پیغام عوام و خواص کے درمیان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تمام معروف ذرائع میں سے بنیادی اور موثر طریقہ انفرادی روابط اور Face to Face دعوت رسانی کا ہے۔ سنت نبوی کے جائزے سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ داعی کا اصل کام لوگوں تک پہنچنا اور قلوب و وجدان کو سوز دروں کے ساتھ جھنجھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے مربوط کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

عصر حاضر کے ترسیلی ذرائع جہاں بہت بڑی نعمت ہیں وہیں اس پہلو سے فتنہ ثابت ہو سکتے ہیں کہ آسانی کے سبب زیادہ انحصار انہیں پر کر لیا جائے۔ پریس کانفرنس، خطابات عام، سمپوزیم، دعوتی مضامین، انٹرنیٹ وغیرہ سے بلاشبہ کام لیا جائے اور اس کے مثبت اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر اب بھی اصل کام انفرادی رابطہ ہی ہے۔

ایک جائزے کے مطابق عوام کی بڑی اکثریت جو ذرائع ابلاغ سے دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر دور جدید کی ذہنی ساخت کے تحت وہ اسلامی تعلیمات یا نظریاتی مباحث سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ بیشتر اوقات نیٹ سے وابستہ رہنے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے سنجیدہ موضوعات دیکھنے اور علمی مباحث میں حصہ لینے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس صورت حال کے بھی واضح اسباب ہیں۔ مغربی ممالک

کے عوام نسبتاً تعلیم یافتہ مانے جاتے ہیں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی عظیم اکثریت دنیا میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتی جتنا کہ تیسری دنیا کے عوام جانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ڈیوٹی کے اوقات میں لگن اور محنت سے مشینی انداز سے کام کرتے ہیں اور پھر فرصت کے لمحات میں Enjoy کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان تک پیغام رسانی کو یقینی کیسے بنایا جائے۔ کیا شکل اختیار کی جائے کہ اسلام کی مثبت تعلیمات ان کے علم میں آسکیں۔ کافی حد تک انسانی اقدار کے حامل افراد و اقوام سے امید رکھنی چاہیے کہ اگر انہیں حقائق کا علم ہو جائے تو وہ حرکتیں نہیں کریں گے جس کا آج کی دنیا میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اخبار بیں حضرات اخبار کی خبروں پر یقین کر لیتے ہیں۔ حکومتی ذمہ داروں کے بیانات کو صداقت پر مبنی تصور کرتے ہیں۔ صحیح صورت حال ان تک پہنچ ہی نہیں پاتی ہے۔ صحیح بات جسے معلوم ہی نہ ہو تو وہ غیر معقول طرز عمل اختیار کرتا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے۔

دیگر ذرائع ابلاغ پر تو دشمنوں کی ہی بالادستی ہے۔ لے دے کر یقینی اور محفوظ راستہ اپنی بات پہنچانے کا فرداً فرداً رابطہ ہی ہے۔

دعاۃ کی تیاری کے ذیل میں عصر حاضر کے تقاضے کے تحت اسلامی لٹریچر کی تیاری و تقسیم شامل ہے۔ یہ اعداد الدعاۃ کے مراکز ہی یکساں لٹریچر ضرورت کے مطابق تیار کریں گے، جو میدان دعوت میں سرگرم افراد کے لیے Feed Back کا کام انجام دیں گے۔ صورت حال یہ ہے کہ خالص دعوتی پیرایہ میں اب تک قرآن کریم کی کوئی مکمل تفسیر تیار نہیں ہو سکی ہے۔ اسی طرح حدیث و سیر اور اسلامی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ بطور خاص غیر مسلم دنیا کو سامنے رکھ کر تیار نہیں کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کلام الٰہی کی برکت اور تعلیمات اسلامی کی کشش کے نتیجہ میں مسلمانوں کے سامنے رکھ کر تیار کیا گیا لٹریچر بھی عوام میں مقبول ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑا طبقہ اسلام آشنا یا حلقہ بگوش اسلام ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اسلامی لٹریچر کو دعوت اسلامی کے لیے موافق حال بنا دیا جائے اور اس میں حکمت دعوت کے لوازمات و تقاضے سمو دیے جائیں تو بلاشبہ ان کی افادیت کئی چند ہو سکتی ہے۔ دراصل دور حاضر میں داعی گروہ کا ہتھیار یہی لٹریچر ہے۔

☆☆☆

نو مارکسیت اور اسلام

ڈاکٹر ملک ریحان احمد*

مارکسیت و اسلام اور کمیونزم و اسلام کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ نیز اس بحث میں بہت سی مماثلات و عدم مماثلات کی نشان دہی بھی کی جا چکی ہے۔ لیکن اسلام اور نو مارکسیت کا موضوع لوگوں کی خاطر خواہ توجہ اپنی طرف نہیں کھینچ سکا۔

نو مارکسیت دراصل متعدد ذیلی نظریات کا مجموعہ ہے جو وسیع تناظر میں داخلی مارکسی دانشوروں کی تنقید اور مارکسیت کی کمیوں کو دور کرنے کے لیے ان کی کوششوں کے نتیجے میں منظر عام پر آیا۔ اس کام میں داخلی مارکسی دانش وروں کی تنقید کے ساتھ ساتھ غیر مارکسی دانش وروں کی تنقید بھی اس کو منظر عام پر لانے میں شریک رہی۔

مارکسی نظریے کی کمیوں کی نشان دہی اور اس کی درستگی کی کوششوں کے باعث متعدد نظری متبادلات منظر عام پر آئے جنھیں ساختیاتی مارکسیت، ہیگلی مارکسیت اور تنقیدی نظریے سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس سیاق میں کارل مارکس کو اس کی معاشی جبریت (Economic Determinism) سمیت متعدد بنیادوں پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ کارل مارکس کے یہاں سماج کی ساری چیزوں کا تعین معیشت یا معاشی ادارے سے ہی ہوتا ہے۔ سماج کے دوسرے سارے ادارے اسی کی بنیاد پر چلتے ہیں اور معاشی ادارہ ہمیشہ بنیادی کردار نبھاتا ہے۔ Althusar جو کہ ایک نو مارکسیت پسند ہے، کہتا ہے کہ معاشی ادارہ نہ صرف اہم ہوتا ہے بلکہ دوسرے اداروں کو بنانے میں اہم کردار نبھاتا ہے لیکن بعض اوقات سیاسی اور مذہبی ادارے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں اور سماجی ساخت کی تشکیل میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔

نو مارکسیت کے تحت متعدد قسم کے ذیلی نظریات آتے ہیں لیکن ان تمام کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میں زیر نظر مضمون میں Jurgon Habermass کے ایک ذیلی نظری حصے پر اپنی توجہ مرکوز کروں گا جو ایک معروف نو مارکسیت پسند ہے اور جس کے نظری کام کو ہم ترسیلی عمل (Communicative Action) کے نام سے جانتے ہیں۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ سماجیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Habermass نے اپنے تصور کا آغاز کارل مارکس کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کیا اور کہا کہ کارل مارکس نے سماج کی ساری چیزوں کو کام سے جوڑ دیا اور دو تجزیاتی اعتبار سے منفرد وجودات میں تمیز کرنے میں ناکام رہا۔ یہ وجودات کام و محنت (Work) اور سماجی تعامل یعنی ترسیلی عمل (Communicative Action) ہیں۔ Habermass نے دونوں کو الگ کرتے ہوئے کام و محنت کو مقصد پرمبنی عقلی عمل سے موسوم کیا اور کہا کہ مقصد پرمبنی عقلی عمل کا حتمی مقصد مادی مقصد کا حصول ہے جب کہ ترسیلی عمل کا حتمی مقصد ترسیلی تفہیم کا حصول ہے۔ اس کا مزید یقین ہے کہ ترسیلی عمل سب سے زیادہ پھیلا ہوا اور امتیازی عمل ہے اور تمام سماجی وثقافتی زندگی کی بنیاد ہے۔ ترسیلی عمل (Communicative Action) چونکہ تمام سماجی وثقافتی زندگی کی بنیاد ہے لہٰذا یہ خود کا اپنا معاشرتی تانا بانا بنتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی مخصوص معاشرے میں افراد کے ترسیلی عمل کو کسی بھی ذریعے سے توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو معاشرے کی مکمل تشکیل اور اس کی ذیلی ساختیں انتشار کا سامنا کریں گی۔

چونکہ اسلام انسانی فطرت کے بہت قریب ہے لہٰذا اس نے اپنے وجود کے ابتدائی دنوں سے ہی اس حقیقت کو اپنا حصہ بنایا۔ قرآنی نفسیات اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرتاً صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ بنی نوع انسان کو فطری احساس بھی عطا کیا گیا ہے کہ اچھے عمل کرے اور برائی سے اجتناب کرے۔ جب انسان کی اس فطری صلاحیت اور احساس کو کوئی سماجی ونفسیاتی طاقت مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو پورا سماجی نظام از خود انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی حقیقی تشکیل اور اس کے دیگر ذیلی نظامات بنی نوع انسان کے فکری عمل سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ اسی لیے Levistrouss نے کہا ہے کہ سماجی نظام بنی نوع انسان کے ذہن کی حیاتی کیمیا کی اپج ہے۔ اس نے انسانی خیال کی طرف اشارہ کیا جو انسان کے ذہنی عمل سے وجود پذیر ہوتا ہے۔

اسلام نے انسانی برتاؤ کے اس مظہر کو محسوس کیا اور بنی نوع انسان کی فطری حقیقت کو مسخ ہونے سے بچایا۔ اسی لیے اسلام نے بنی نوع انسان کے لیے متعدد اخلاقی اور قانونی احکامات جاری کیے۔

اگر ہم اس ترسیلی عمل کے نظریہ کو وسعت دیں اور مسخ شدہ ترسیل کی تشریح کرنے کی کوشش کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دروغ گوئی ترسیل کی سب سے زیادہ مسخ شدہ شکل ہے۔ جب کہ Habermass نے اس طرح کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دروغ گوئی کے اسباب ذاتی ہو سکتے ہیں یعنی انسان خود اپنے ذاتی دباؤ کی وجہ سے جھوٹ بولتا ہے یا سیاسی وسماجی یعنی بیرونی دباؤ کے باعث بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ Habermass کے الفاظ میں یہ دباؤ غیر مسخ شدہ ترسیل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

اسلام ترسیل کو مسخ کرنے والے عوامل کو ختم کرنے کے لیے اخلاقی معیار کی بات کرتا ہے۔ انسان خود کے دباؤ میں آ کر جھوٹ بولتا ہے۔ مثلاً لالچ کا دباؤ، غیر قانونی وغیر اخلاقی فائدوں کا دباؤ یا پھر اپنے آپ کو ایسے ان چاہے حالات سے بچانے کے لیے جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے۔ یہ سارے عوامل انسان کے اندر دباؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جو انسان کے جھوٹ بولنے میں بنیادی کردار نبھاتے ہیں۔ اسلام نے اس حقیقت کو پہچانتے ہوئے انسانی نفسیات میں ایک سیفٹی وال Safety Value لگانے کی کوشش کی ہے تا کہ یہ سارے دباؤ جو انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہیں بالکل جا یا کریں اور دباؤ بننے ہی نہ پائے۔ اسلام کہتا ہے "الکذب من الکبائر" یعنی جھوٹ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر کوئی شخص اپنی زبان اور شرمگاہ کی ضمانت لے تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت لیتا ہوں۔" اسلام یہ بھی مانتا ہے کہ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ تمام اخلاقی حدود اور رہنمائیاں اسلام کی طرف سے اٹھائے گئے تحفظاتی اقدام ہیں تا کہ انسانی زندگی میں بات چیت کو غلط عناصر سے بچایا جا سکے۔

Habermass کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی سوچ انسان کی ان نفسیاتی کمزوریوں تک نہیں پہونچ سکی۔ وہ صرف انھیں اسباب تک رہ گیا جن کو ہم سماجی وسیاسی اسباب کہہ سکتے ہیں اور اسی لیے اس نے صرف بولنے کی آزادی (Freedom of Speech) کی بات کی۔ اس کے مطابق اس نظریے کا مقصد لوگوں کی باتوں کو سمجھنا اور ایک ایسے سماج کی تشکیل ہے جس میں لوگ آزادانہ طور سے اپنی باتیں کہہ سکیں اور ان کا دفاع کر سکیں۔ یہ مقصد اپنے آپ میں آزادیٔ رائے کی وکالت کرتا ہے۔ آزادیٔ رائے یا بولنے کی آزادی کا تعلق یقیناً سماج کے سیاسی وسماجی ڈھانچوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے Habermass انھیں اسباب کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے جو بولنے کی آزادی میں رکاوٹ ہیں۔

اسلام مشروط آزادیٔ رائے کی وکالت کرتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ وہی ساری باتیں کہنے کی آزادی ہونی چاہیے جو سچ ہوں۔ ایک حدیث میں آیا ہے "کہو تو سچ کہو ورنہ چپ رہو۔" یہ شرط انسان کے اندر پیدا ہونے والے اس دباؤ کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے جو انسان کو جھوٹ بولنے پر اکساتا ہے۔ اسلام نے انسان کے اندرونی نفسیاتی اسباب پر زیادہ زور دیا ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں یہ مسخ شدہ بات چیت کی اہم وجہ ہے۔

سماجی اور سیاسی سطح کے دباؤ کو آسانی سے روکا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں ایک سے زیادہ افراد ملوث ہوتے ہیں۔ مگر انسان کا اندرونی دباؤ جو ایک ہی انسان کے اندر پروان چڑھتا ہے، اس کو روکنا ہرگز آسان نہیں ہوتا، بطور خاص ظاہری قوانین بنا کر۔ اس کا امکان صرف انسانی شخصیت کے اندر اس کی

چیزوں کے دخول کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو انسانی ذات کے اندر پیدا کرنے والے دباؤ کو باہر کا راستہ دکھا سکیں۔ اسلام نے اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس دباؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

Habermass کا ماننا ہے کہ عمل کی صحیح باتوں کی تصحیح سے ممکن ہے۔ اگر آزادی رائے یا بولنے کی آزادی کو مسخ ہونے سے بچا لیا جائے تو عمل خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا ماننا ہے کہ ترسیل یعنی بات چیت انسان کی سماجی و ثقافتی زندگی کی بنیاد ہے۔ سچ کی تشریح کرتے ہوئے Habermass کہتا ہے کہ سچ کا مطلب ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا ہے یعنی آزادانہ بات چیت سے ہر طرح کی رکاوٹوں کو ہٹانا۔ اسلام نے اسی طرح کی آزادی کی کوشش کی ہے اور مزید اس نے نفسیاتی سطح سے لے کر سماجی سطح تک اس کے لیے اقدامات کیے ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔

Habermass مباحثہ اور بات چیت کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بات چیت یا ترسیل انسان کی روز مرہ زندگی میں پیش آنے والی چیز ہے جب کہ مباحثہ نہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ مباحثے میں اچھے دلائل اور وزن کی بنیاد پر باتوں کی جیت درج ہوتی ہے۔ اسلام کے برخلاف وہ (Consensus Theory of Truth) کو مانتا ہے۔ یعنی اکثریت یا سارے لوگ جس چیز کو صحیح سمجھ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ جب کہ اسلام Reality Theory of Truth کو مانتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق سچائی ہمیشہ سچائی ہے، چاہے اکثریت اس کو مانے یا نہ مانے۔ اسلام کا یہ نظریہ اس کے ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہے جو بتاتے ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا، وہ انسان کی ساری کمزوریوں اور طاقت سے باخبر ہے۔ ان کمزوریوں اور طاقت کو نظر میں رکھتے ہوئے اللہ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے قوانین بنائے تاکہ وہ پرسکون زندگی گزار سکیں۔ یہ بنیادی اصول انسانی مباحثات میں کسی ایسی چیز کے لیے صرف اس لیے کہ اکثریت اسے قبول کرتی ہے، کوئی جگہ نہیں چھوڑتے جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتی ہوں۔

مثلاً اسلام کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ شراب کھلے عام بیچی جائے اور استعمال کی جائے صرف اس بنیاد پر کہ کسی جگہ کی اکثریت ایسا چاہ رہی ہے۔

اسلام انسانی فطرت سے کافی قریب ہے اور اس لیے انسانی سماج کو بگاڑ سے بچانے کے لیے اس نے نفسیاتی اور سماجی دونوں سطح پر اقدامات کیے ہیں۔ مختلف نظریات شروع سے آج تک ان جگہوں پر کمزور نظر آتے ہیں جہاں وہ اسلامی اقدار سے دور جانے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر اسلامی اصولوں تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ یہی حال تو مارکسیت کا بھی دکھائی دیتا ہے۔ مسلم دانشوروں کو اس جہت میں کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

☆☆☆

حقوق انسانی ...... ایک روداد سفر

ابو بکر سباق سبحانی

کسی بھی سماج، حکومت یا ریاست کی خوشحالی، پائیداری و قانونی استحکام کا اندازہ سب سے پہلے حقوق انسانی کے متعلق پائی جانے والی صورت حال سے لگایا جاتا ہے۔ آج ہم کسی بھی حکومت کی پالیسی، طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے اس کے ہر فیصلے کو، موجودہ تمام مسائل کی ہر نوعیت کو، اس کے خاتمے کے لیے پیش کردہ ہر نظریے یا حل کو وہاں کی عوام، ان کی فلاح و بہبود سے مربوط کر کے اس کے معیار و حساسیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ غرض ہم ہر شے میں انسانی بھلائی، انسانی تحفظ اور حق کا دعویٰ، اپنی طاقت، اور حاصل شدہ مراعات یا مراعات کے حصول کا نظریہ پیش کرتے ہیں، چاہے وہ جس معیار یا پیمانے پر ہو، وہ اپنے سماج، ریاست، حکومت، ادارے یا گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں ہمارے ساتھ یہ برتاؤ کیوں؟ کیا ہمیں جینے کا حق حاصل نہیں ہے؟ کیا اس طرح ہم اپنی زندگی انسانی اقدار و احترام کے ساتھ گزار سکتے ہیں؟ کیوں کہ ہم بخوبی جانتے اور مانتے ہیں اپنے حقوق کو، جسے اصطلاح میں حقوق انسانی (ہیومن رائٹس) کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کے لیے ہم جدوجہد کرتے ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی صرف اپنے لیے آہ و بکا کرتا ہے تو کسی کے سینے میں پوری انسانیت کا درد ہوتا ہے، وہ خود بھی جینا چاہتا ہے اور دوسرے انسانوں کی فلاح و بہبود کا بھی خواہاں ہوتا ہے، وہ دوسروں کے حقوق غصب نہیں کرتا بلکہ ان کے تحفظ کے لیے پوری تگ و دو بھی کرتا ہے۔

حقوق انسانی کا نظریہ ایک مساواتی نظریہ ہے کہ ہر انسان قدرتی و پیدائشی حق کا مالک ہے۔ اگر اس نے اس سرزمین پر آنکھیں کھولیں ہیں تو اسے پورا حق ہے کہ وہ زندہ رہے، اس کی سانسیں روکنے کا حق صرف اسی کو ہے جس نے اس کو سانسیں بخشی ہیں، کسی انسان کی زندگی یا موت کا فیصلہ کوئی انسان نہیں کرے گا، اگر اس کی بساط ہے تو وہ اپنی بساط کے مطابق زندگی کی ہر سہولت کا پورا پورا فائدہ اٹھائے گا، ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے، کسی کی غلامی میں زندگی کیوں بسر کرے؟ (اگرچہ آج بھی صرف ہندوستان میں ۱۸ ملین سے زائد بچے بندھوا مزدور (غلام) ہیں جن میں بیشتر سرکاری کارخانوں میں

کام کرتے ہیں)۔ ہر انسان کی املاک محفوظ رہیں گی۔ اس کو ہمیشہ ہر جگہ برابر مواقع حاصل ہوں گے، چاہے اس کی قومیت، جائے پیدائش، جائے سکونت، ذات، طبقہ، رنگ، نسل، جنس، زبان یا مذہب کچھ بھی ہو۔ آج دنیا کا ہر دستور، ہر قانون ان اصولوں کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔ ہر انسان کو بھی اس کا پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔

اس نظریہ نے بھی شاید اسی وقت جنم لیا تھا جب انسان نے جنم لیا تھا، اور شاید انسانی جان کے تحفظ کا سوال بھی اسی وقت اٹھا تھا جب اس کرۂ ارض پر پہلا خون بہا تھا۔ اگرچہ نوع انسانی کی ابتداء کے ساتھ ہی اس نظریہ یا اصول کی ابتداء بھی یقیناً ہو گئی ہوگی تاہم اس اصول کی اہمیت وحیثیت کیا تھی اس کا اندازہ لگانا کافی مشکل امر ہے۔ زمانہ قدیم کے عظیم مفکر ارسطو نے حقوق انسانی کے سلسلے میں اپنے نظریات پیش کیے تھے جس میں حق ملکیت اور سماجی معاملات میں دخل اندازی کے حق کا تذکرہ ملتا ہے، مگر یونانی یا رومی روایات میں حقوق انسانی کو کسی آفاقی نظریے کی اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ غلامی کی رسم کو قدرتی حالات وسہولت کا درجہ حاصل رہا تھا۔ دور وسطیٰ میں، اگرچہ برطانیہ کے شہنشاہ جانس کے شاہی اختیارات کو میگنا کارٹا نے ضرب لگائی، ایک حد تک وہ اپنے لامتناہی شاہی اختیارات کو انسانوں کے خلاف استعمال کرنے کے سلسلے میں محدود ہو گیا، اس کو قانونی پیش رفت میں پہلا دستوری دستاویز کہا جا سکتا ہے جو حقوق انسانی کا قانون کم بلکہ سیاسی قانون کی زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس کو اس کے سیاسی حریفوں نے اپنی جان و مال کے تحفظ کے پیش نظر تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۲۱۵ عیسوی میں میگنا کارٹا سے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے، حالانکہ یہ دستاویز براہ راست ۱۱۰۰ عیسوی میں عمل میں آئے چارٹر آف لیبرٹیز کی ہی ایک ترمیم شدہ قرارداد تھی جس کے ذریعے بادشاہ ہنری اول کے اختیارات محدود ہوئے تھے، اسی کی براہ راست تقویت سے میگنا کارٹا کا معاہدہ عمل میں آیا۔ لارڈ ڈینگ میگنا کارٹا کو انسانی تاریخ کا سب سے اہم دستوری دستاویز کا درجہ دیتے ہیں جس کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کے ظلم وستم کے خلاف انفرادی آزادی کی بنیاد رکھی گئی۔ انگریزی تاریخ کا یہ دور سنہری دور کہا جاتا ہے۔

سفر آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ یورپی تاریخ کا پہلا باقاعدہ حقوق انسانی کا دستاویز ۱۵۲۵ عیسوی کے بارہ دفعات (Twelve Articles) ہیں، جو جرمنی میں کسانوں کی مانگ پر کسان جنگ کے دوران سوابین لیگ نے تسلیم کیے، پھر برطانیہ میں انگلش بل آف رائٹس کو ۱۶۸۳ عیسوی میں تسلیم کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی تک آتے آتے حقوق انسانی کا سفر ایک بڑے انقلابی پڑاؤ تک پہنچ گیا۔ ایک نئی تاریخ لکھی گئی جس کو پہلے امریکہ نے ۱۷۷۶ عیسوی میں پھر فرانس کی سرزمین نے ۱۷۸۹ عیسوی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا، عام انسان اب ظالم بادشاہوں کے ظلم وستم کو مزید برداشت نہ کر سکتا تھا، تاریخی

انقلاب رونما ہوئے، ریاستہائے متحدہ امریکہ کا فرمان آزادی (United States Declaration of Independence1776) اور فرانس کا فرمان برائے حقوق انسان وشہری (Declaration of the Rights of Man and of the Citizen) کا اعلان ہوا۔ دونوں انقلابوں نے متعدد قانونی شقوں کو جنم دیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اپنے فرمان میں صاف صاف تحریر کیا کہ .... ہم اس لاانتہائی حقیقت سے روگردانی نہیں کر سکتے کہ تمام انسان برابر ہیں، وہ اپنے خالق کے ذریعے بہت سے بنیادی حقوق سے نوازے گئے ہیں، ان میں زندگی، آزادی اور خوش رہنے کے حقوق شامل ہیں۔

اٹھارہویں وانیسویں صدی عیسوی میں بہت سے مفکروں نے حقوق انسانی کے فلسفہ کو بہت جلا بخشی، جن میں تھامس پینی، جان اسٹیوارٹ مل اور ہیگل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انیسویں صدی میں غلامی کا رواج حقوق انسانی کی بحث کا مرکزی موضوع بن گیا، غلامی کے خاتمے کے لیے تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اس دور میں ولیم ولبرفورس نے اس سلسلے میں اہم قائدانہ کردار ادا کیا۔ تحریک جیسے جیسے مضبوط ہوتی گئی غلامی کی زنجیریں کمزور ہوتی گئیں، بالآخر ۱۸۰۷ عیسوی میں تجارت برائے غلام قانون اور پھر ۱۸۳۳ عیسوی میں خاتمہ برائے غلامی جیسے قانون روبہ عمل آئے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بہت سی شمالی ریاستوں میں غلامی پر پابندی لگ گئی۔ بیسویں صدی عیسوی میں حقوق انسانی کے علم بردار افراد و تحریکوں نے عالمی پیمانے پر سماجی بدلاؤ لانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ مزدور تنظیموں نے اپنے لیے تنظیم بنانے، مانگوں کو پورا کرانے کے لیے ہڑتال کرنے، کام کے اوقات وحالات کے نفاذ، بچہ مزدوری کی خاتمے یا ضوابط منظم کرنے کے حقوق حاصل کیے۔ عورتوں کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ بہت سے ماتحت یا غلام ممالک میں اسی دوران قومی آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ بہت سے ممالک میں جہاں نسلی یا مذہبی اقلیتیں ظلم وتعصب کا شکار تھیں، وہاں مساوات وحقوق انسانی کی کامیاب نبرد آزمائی ہوئی، خصوصاً ایشیائی وافریقی ممالک میں، جن میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کا قیام عمل میں آیا، لائبر کوڈ اور جنیوا کنونشن ۱۸۶۳ عیسوی نے عالمی سطح پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

حقوق انسانی کی تحریکیں جنم لیتی اور جدوجہد کرتی رہیں، تاریخ رقم ہوتی رہی، چھوٹے بڑے واقعات وحادثات ہوتے رہے، انسانی اقدار کی پامالی کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر مزید منظم بحث و مباحثے ہر ملک میں ہوتے رہے۔ پہلی جنگ عظیم ہوئی، پوری دنیا ابھی اس سے ہونے والی بربادی وتنگ حالی سے پوری طرح ہوش میں بھی نہ آسکی تھی کہ دوسری جنگ عظیم برپا ہو گئی۔ بربادی، ہلاکت، ویرانی اور غربت نے آدھی سے زیادہ دنیا کو تباہ وبرباد کر دیا، نقصانات کا آج تک اندازہ نہیں لگایا جا سکا، چاہے وہ جانی نقصانات ہوں ہو یا مالی نقصانات۔ اقوام عالم نے اقوام متحدہ کی شکل میں ایک

متحدہ پلیٹ فارم تشکیل کیا، جس نے ۱۹۴۸ عیسوی میں ایک ہمہ گیر و عالمگیر منشور برائے حقوق انسانی کا اعلان کیا (UNDHR.1948) جس کے بعد موجودہ حقوق انسانی کے نظریہ نے ایک آفاقی قانون کی شکل اختیار کرلی۔ منشور کی تیس دفعات بہت سے انسانی حقوق پر منحصر ہیں، جن میں حقوق برائے زندگی، آزادی، مساوات، تحفظ اور حق ملکیت وغیرہ خاص ہیں، جو انسانی وجود کی بقاء و ارتقاء کے لیے ناگزیر حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام حقوق باہم مربوط، ایک دوسرے پر منحصر و ناقابل تقسیم ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً ان انسانی حقوق کو معاہدے، اقرار نامے، قرارداد، گفت و شنید، بین الاقوامی قوانین، عمومی اصول نیز بین الاقوامی و قومی قوانین کے دیگر وسائل پختگی و پائیداری عطا کرتے رہے۔ بین الاقوامی حقوق انسانی کے قوانین دیگر ملکی حکومتوں کو ان کی ذمہ داریوں کے تئیں حساس بناتے اور قانون سازی میں رہنمائی بخشتے رہے۔

دور جدید میں فرد واحد یا افراد کی جماعت کے حقوق کے تحفظ و ارتقاء اور آزادی کے اس پیچیدہ سفر کو ہم حقوق انسانی کے متعدد ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

حقوق انسانی کے سفر کا پہلا دور جس میں خاص طور سے انسان کی ذاتی آزادی (Liberty) اور سیاسی زندگی میں شرکت کے حقوق حاصل ہوئے، یہ بنیادی طور پر سیاسی و سماجی نوعیت کے حامل تھے تاکہ حکومتی جبر و استبداد سے انسان کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ اس کا سفر بہت طویل ہے جو زمانہ قدیم میں میگنا کارٹا یا مشہور فلسفی ارسطو کے فلسفہ سے شروع ہوکر اقوام متحدہ کے منشور برائے حقوق انسان (UNDHR.1948) اور بین الاقوامی اقرار نامہ برائے سماجی و سیاسی حقوق (ICCPR, 1966) تک پہنچتا ہے۔

حقوق انسانی کے سفر کے دوسرے دور میں مساوات (Equality) کو خصوصی اہمیت دی گئی، جس کی بنیادی نوعیت سماجی، معاشی اور ثقافتی رہی۔ اس میں روزگار کا حق، صحت کی سہولیات (Health Care) کا حق نیز سماجی تحفظ و بے روزگاری بھتہ کے حقوق شامل ہیں۔ اس دور میں بنیادی طور پر بین الاقوامی قرارداد برائے معاشی، سماجی و ثقافتی حقوق (ICESCR,1966) کو سنگ میل کی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا پڑاؤ یا اس سفر کا تیسرا دور حقوق انسانی کے ارتقاء کا دور تھا۔ اب تک سماجی و معاشرتی حقوق پوری طرح وجود میں آ کے پائیداری کے منازل طے کرچکے تھے، چنانچہ اس دور میں بنیادی حقوق سے بالاتر ہوکر وہ حقوق تشکیل دیے گئے جو بین الاقوامی قوانین کی ترقی پسندانہ قرارداد کے نام سے موسوم ہیں۔ جن میں جماعتی یا اجتماعی حقوق، حق تعین و فیصلہ، حق برائے معاشی و سماجی ارتقاء، حق برائے

ماحولیات (Environment)، حق برائے قدرتی وسائل، حق اطلاع و حق برائے خبر رسانی، ثقافتی ورثہ میں شرکت کا حق شامل ہیں۔ اس تناظر میں متعدد بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے انسانی ماحولیات ۱۹۷۲ عیسوی، اقوام متحدہ کی قرارداد برائے حق ارتقاء ۱۹۸۶ عیسوی اور اقرار نامہ برائے ماحولیات و ارتقاء ۱۹۹۲ عیسوی، نے قابل تعظیم کردار ادا کیے۔

ہندوستانی پس منظر میں حقوق انسانی کی تعریف ہم کو ہندوستانی قانون برائے تحفظ حقوق انسان کے سیکشن 2 (d) کے اندر اصطلاح حقوق انسانی کی وضاحت ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ''وہ حقوق جو انسان کی زندگی، آزادی، مساوات اور ایک فرد کے ذاتی وقار سے متعلق ہوں، نیز جن کی ضمانت دستور ہند یا کسی بین الاقوامی قرارداد کے ذریعہ دی گئی ہو اور وہ ہندوستان کی عدالتوں میں نافذ ہوں، وہ حقوق انسانی کی اہمیت و حیثیت کے حامل ہوں گے۔ قانون کے ذریعہ دستوری شکل کا حامل ایک قومی کمیشن برائے حقوق انسانی تشکیل دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ صوبوں میں صوبائی کمیشن برائے حقوق انسانی ہوں گے، حقوق انسانی کے معاملات و مسائل کے حل و تحفظ کے مقصد سے خصوصی عدالتیں برائے حقوق انسانی کا قیام بھی عمل میں آئے گا، تاکہ حقوق انسانی کو بخوبی تحفظ فراہم کیا جاسکے۔''

حقوق انسانی قوانین و قراردادوں کے اہم سنگ میل :

۱۹۴۸...... عالمگیر قرارداد برائے حقوق انسانی۔

۱۹۴۹...... جنیوا کنونشن

۱۹۵۳...... کنونشن جس میں انسانی تجارت کو ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۹۵۷ ...... کنونشن برائے قومیت شادی شدہ خواتین

۱۹۵۹ ...... کنونشن جس میں ولادت سے قبل لڑکیوں کا رحم مادر میں ہی قتل کردیے جانے کی ممانعت اور سزا کا اعلان ہوا۔

۱۹۶۰...... ضمنی کنونشن برائے خاتمہ غلامی، تجارت غلام نیز وہ ادارے یا عمل جو غلامی کے مشابہ ہوں بخلاف قانون ٹھہرایا گیا۔

۱۹۶۱...... کنونشن جس میں خواتین کو سیاسی حقوق عطا کیے گئے۔

۱۹۶۸...... کنونشن جس میں ہر قسم کے نسلی تعصب کو ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۹۷۹...... قرارداد برائے معاشرتی و سیاسی حقوق

۱۹۷۹...... قرارداد برائے معاشی، سماجی و ثقافتی حقوق

۱۹۸۱.....کنونشن جس میں خواتین کے خلاف تمام قسم کے تعصب کو خلاف انسانیت قرار دیا گیا۔

۱۹۹۲.....کنونشن برائے حقوق اطفال

۱۹۹۷.....کنونشن جس میں سبھی قسم کے اذیت ناک، غیر انسانی یا غیر معیاری قسم کی سزاؤں کو ممنوع قرار دیا گیا۔

۲۰۰۵.....کنونشن جس میں کرپشن کو ممنوع و خلاف قانون قرار دیا گیا۔

۲۰۰۶.....کنونشن جس میں تمام انسانوں کو جبری گمشدگی سے تحفظ فراہم کیا گیا۔

قوانین برائے حقوق انسانی:

☆ بچہ مزدوری (ممانعت وضوابط) قانون، ۱۹۸۶ء۔

☆ قومی کمیشن برائے اقلیات قانون، ۱۹۹۰ء۔

☆ قومی کمیشن برائے خواتین قانون، ۱۹۹۰ء۔

☆ قومی کمیشن برائے درج فہرست ذات و درج فہرست قبائل (دستور ۶۵ ویں ترمیم) قانون، ۱۹۹۰ء۔

☆ تحفظ برائے حقوق انسانی قانون، ۱۹۹۳ء۔

☆ قومی کمیشن برائے پسماندہ طبقات قانون، ۱۹۹۳ء۔

☆ معذور افراد (مساوی مواقع، تحفظ حقوق و مکمل شمولیت) قانون، ۱۹۹۵ء۔

☆ عدلیہ برائے کمسن اطفال (نگہداشت و تحفظ برائے اطفال) قانون، ۲۰۰۰ء۔

☆ حق برائے خوراک (Food) کو نافذ کرنے کا سپریم کورٹ آف انڈیا نے حکم دیا، ۲۰۰۱ء۔

☆ حق برائے اطلاع (RTI) قانون، ۲۰۰۵ء۔

☆ قومی دیہی روزگار گارنٹی (NREGA) قانون، ۲۰۰۵ء۔

اقدامات برائے تشکیل حقوق انسانی مجالس:

..... قومی کمیشن برائے خواتین

..... قومی کمیشن برائے درج فہرست ذاتیں

..... قومی کمیشن برائے درج فہرست قبائل

..... قومی کمیشن برائے اقلیات

..... قومی کمیشن برائے صفائی ملازمین

..... قومی کمیشن برائے تحفظ حقوق اطفال

..... قومی کمیشن برائے حقوق انسانی

اٹھارہ (۱۸) صوبائی حکومتیں صوبائی کمیشن برائے حقوق انسانی تشکیل دے چکی ہیں۔ ان میں آندھرا پردیش، آسام، بہار، چھتیس گڑھ، گجرات، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، کرناٹک، کیرل، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، منی پور، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، تمل ناڈو، اتر پردیش اور ویسٹ بنگال شامل ہیں۔

یوں رفتہ رفتہ حقوق انسانی نے منزل بہ منزل اپنا سفر متعدد ادوار میں یہاں تک پورا کیا، جو آج بھی جاری ہے۔ انسانوں نے انسانوں کے حقوق کے تحفظ کے مقصد سے جو قوانین تشکیل دیے اور نافذ کیے ہم ان کا ایک سرسری جائزہ درج بالا سطور میں لے چکے ہیں۔ آج دنیا کے ہر ملک کا دستور، ہر ملک میں نافذ قوانین حقوق انسانی کا پورا پورا احترام کرتے ہیں، وقتاً فوقتاً اس میں حسب ضرورت ترمیم کر کے حالات حاضرہ کے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد صرف اور صرف انسانوں کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کر کے ان کی زندگی کو مزید آسان تر و معیاری بنایا جاتا ہے۔ یہ انسانی کوششوں اور کاوشوں ہی کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے آج انسانی حقوق ماضی کے بالمقابل بہت زیادہ محفوظ ہیں۔

انسانی کوششوں و کاوشوں کے علاوہ اس دنیا میں جنم لینے والے تمام مذاہب کی تعلیمات ہم کو بنیادی طور پر ایک اچھا انسان بننے و انسانیت کے اقدار و حقوق کا احترام کرنے پر منحصر نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ زمانہ قدیم کے مذاہب بدھ مذہب یا جین مذہب کی تعلیمات ہوں، آسمانی مذاہب یعنی عیسائیت یا یہودیت و اسلام کی تعلیمات ہوں یا دور وسطیٰ کے سکھ مذہب کی تعلیمات ہوں، سبھی مذاہب تمام انسانوں کو برابر و یکساں شمار کرتے ہیں، ہندو مذہب کی ذات پات کی رسومات یا دیگر مذاہب سے مشابہ رسم و رواج ہندو کے انسانوں کی ذہنی اپج ہیں جن کی ہر دور میں مخالفت ہوتی رہی ہے، آج بھی یہ مخالفت جاری ہے۔ اسلام میں حقوق اور مساوات کی تعلیمات اپنا ایک عظیم مقام رکھتی ہیں جسے خصوصاً ہندوستانی پس منظر میں یہاں کے سماج کی رسومات نے بہت زیادہ متاثر کر دیا ہے۔ بہر کیف ہم مذہبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی سبھی نظریات کی رو سے تمام انسانوں کو آج کم از کم اصولی طور پر آزاد اور مساوی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

ان تمام نظریات، اصول اور قوانین کے باوجود اگر آج ہم اپنے ملک، سماج، معاشرے میں انسانیت وقتاً فوقتاً سسکتی یا دم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، آج بھی حقوق انسانی کی اگر خلاف ورزی ہوتی ہے، ہمارے سماج میں ایسے عناصر اگر پیدا ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے انسانی اقدار کو خطرات لاحق ہوتے ہیں، معاشرے میں کمزور یا بے بس ہونے کی، معصوم انسانوں کو غربت یا پسماندگی کے عوض ظلم و زیادتی کی سزا ملتی ہے تو اس کے ذمہ دار یہ دستاویزات، قرار داد اور قوانین نہیں بلکہ ہم اور ہمارا سماج ہے۔ یہ ہمارا مذہبی، سماجی نیز اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ ہم مظلوم کو اس پر روا ظلم سے تحفظ فراہم کریں، اس کے حقوق کی

حفاظت کے لیے حتی المقدور اقدامات کریں، سماج کے سرکردہ افراد کو اس بابت پیش قدمی کے لیے مجبور کریں، خود کو سماج کا ایک ذمہ دار فرد تسلیم کرتے ہوئے سماج کی فلاح و بہبود کی خاطر ذاتی و سماجی وسائل کا، قانونی و حکومتی ذرائع کا باضابطہ استعمال کریں، سماج کے مسائل کی جڑیں سماج ہی میں پیوست ہوتی ہیں۔ الزامات یا بہانے تراش کر کے اپنا دامن جھاڑنے کی کوششوں کی جگہ اپنی کوتاہیوں یا تساہلی کا اقرار کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو قبول کریں، مسائل کے حل تلاش کریں، اپنا محاسبہ خود کریں، اگر ہم صدق دل سے سماج نیز اس کے ہر فرد کی بہی خواہی کے لیے ان فرائض کے تئیں حساس ہو گئے جن کا مکلف ہمارا سماج اصولی و اخلاقی طور پر ہم کو بناتا ہے تو یقیناً ہم اپنی سعی و کوشش سے ایک بے مثال سماج کی نشوونما میں کامیاب ہوں گے جس میں ہر کمزور و ناتواں کے تمام حقوق انسانی مکمل طور سے محفوظ ہوں گے۔

☆÷×÷☆

مسلم بچیوں کی تعلیم وتربیت کا قابل اعتماد مرکز

جامعة البنات الصالحات

قیام وطعام کی سہولیات کے ساتھ

اطفال سے فضیلت تک

بانی

حکیم محمد ادریس صاحب مرحوم

ناظم

ڈاکٹر سالم مسعود ندوی

مولانا محمد فاروق ندوی

برائے رابطہ:

جروا روڈ، تلسی پور، بلرام پور، یوپی۔ موبائل نمبر: 9695766576

فلسطینی مزاحمت: شعور کا ارتقاء یا انحطاط

تحریر: ڈاکٹر محسن صالح

ترجمہ: ابوالاعلی سید سبحانی

ایک قدیم قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر سے کافی گلہ شکوہ کیا کرتی تھی، سبب یہ تھا کہ وہ اور اس کے بچے سب ایک ہی کمرے میں گزر بسر کیا کرتے تھے جو ان کے لیے تنگ اور ان کی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ شوہر کے ساتھ پریشانی یہ تھی کہ وہ اتنا تنگ دست تھا کہ ان حالات کو بدلنے کے لیے خود کو بے بس محسوس کرتا تھا۔ بیوی کی ملامت سنتے سنتے جب وہ تنگ آ گیا تو اس نے ایک دن فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک سبق سکھائے گا۔ وہ گیا اور کہیں سے ریشم کے زندہ کیڑوں کا ایک صندوق اٹھا لایا اور بیوی سے کہا کہ اس کے لیے گھر کے اندر جگہ بناؤ کیونکہ یہ ایک دوست کی امانت ہے، وہ جب واپس آئے گا تو لے کر چلا جائے گا۔ یہ سننا تھا کہ بیوی اس پر برس پڑی لیکن اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ شوہر کی بات مان لے۔

دوسرے روز وہ کچھ بطخ وغیرہ لے آیا اور اصرار کر کے ان کے لیے بھی گھر میں انتظام کرا لیا۔ اگلے روز ایک کتا لایا اور پھر چوتھے روز ایک گدھا پکڑ لایا۔ باوجود اس کے کہ وہ غصہ سے لال پیلی ہو جاتی تھی لیکن اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ آخرکار صورتحال پر سمجھوتہ کرے، کیونکہ اس سے بہتر کوئی راہ نہیں تھی۔

اس بری حالت میں، بدبو اور سخت کریہہ آوازوں کے درمیان پریشان حال عورت نے منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے گھر کو آزاد کرائے گی اور حیوانات نے اس سے جو کچھ چھین رکھا ہے اسے کسی طرح واپس حاصل کرے گی، اب اس کے ذہن سے مکان کی توسیع کا منصوبہ باہر نکل چکا تھا، اب اس نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام ہی پرامن ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنا مطالبہ پورا کرانا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ شخص گدھا لے کر چلا گیا، اس کی بیوی خوشی سے جھوم اٹھی کہ گدھے کی آواز، اس کی بدبو اور اس کی لاتوں سے چھٹکارا نصیب ہوا۔ اب اس نے بچوں کے لیے جگہ وسیع کر لی، پھر یکے بعد دیگرے کتا، بطخ وغیرہ سب کی واپسی ہو گئی اور بیوی نے پے در پے فتح کے خوب جشن منائے۔

اب اس پریشان حال عورت نے اپنے شوہر کا خوب شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے یہ کشادہ گھر سکونت کے لیے فراہم کیا، وہ فتح و کامیابی کے کیف و سرور میں تھی کہ اس نے اپنے غصب شدہ قانونی حقوق حاصل کر لیے۔

قصہ کا حاصل یہ ہے کہ بدترین تجربہ انسان کو بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بجائے بدتر پر قانع کر دیتا ہے۔

شعور کا انحطاط

تاریخ انسانی اس بات پر شاہد ہے کہ ظالمانہ رویہ مختلف زمانے میں مختلف انداز سے اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال غلاموں یا سماج کے نچلے طبقات کے ساتھ سلوک ہے۔ مخالف قوت کے خلاف تفتیشی ذرائع کا استعمال ہے، جیسا کہ استعماری طاقتیں ان کو استعمال میں لاتی رہی ہیں۔ ان مختلف ذرائع کا استعمال اسرائیلی صہیونیوں نے بھی عرب ممالک اور فلسطینی قوم اور ان کی مزاحمتی جماعتوں کے ساتھ کیا ہے۔ دشمن جس انتقامی طاقت کا مالک ہوتا ہے، اور مزاحمین کے ساتھ جس سخت انتقام کا خواہاں ہوتا ہے، شہریوں کے اوپر جیسی سخت سے سخت اجتماعی سزا نافذ کرنا چاہتا ہے، خوں ریزی، بستیوں کو ویران کرنا، قصہ حیات صدیوں پیچھے پہنچا دینا، حصار بندی، روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پر پابندی، طبی سہولیات سے محرومی، قید و بند اور تعذیب کے سخت سے سخت ذرائع کا استعمال ۔۔۔ یہ تمام وسائل ہیں جن کی مدد سے اسرائیل فلسطینیوں کو نفسیاتی طور سے شکست دینا اور ان کے اندر کمزوری کا احساس و شعور پیدا کرنا چاہتا ہے، تاکہ وہ صورتحال کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں۔

شاید کہ 'شعور کے انحطاط' کی تعبیر اس حالت کے لیے مناسب ترین تعبیر ہے۔ اس تعبیر کو اول اول ایک اصطلاح کے طور پر موشیہ یعلون نے استعمال کیا تھا جو کہ اسرائیلی فوج کا سابق جنرل ہے۔ ممکن ہے کہ شعور کے انحطاط کی تعبیر میں اختلاف ہو جائے کیونکہ شعور کے انحطاط اور ارتقاء کے درمیان ایک راکھ کا ڈھیر ہے، البتہ اتنی بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ شعور کا ارتقاء ہوتا ہے تو اس میں مزاحمت نئے نئے طریقے اپناتی ہے اور ایجاد کرتی ہے۔ اس کے اندر اس بات کی قدرت ہوتی ہے کہ موجودہ حالات اور بدلتے ہوئے ظروف میں بہترین انداز میں کام کو آگے بڑھایا جائے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اس کے اندر نہ کوئی انحراف وجود میں آئے اور نہ ہی اپنے اساسی ہدف پر مصالحت ہو۔

شعور کے انحطاط کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے نئے طریقے اور سیاست اپنائی جائے جس میں اصلی ہدف سے انحراف پایا جاتا ہو، یا اس سے کوئی مصالحت ہو یا پیچھے ہٹ جانا ہو۔ یہاں تک کہ یہ نوبت

آجائے کہ دشمن کی شرائط پر اتفاق ہو جائے یا کم از کم اختلاف باقی نہ رہے یا پھر اس سائبان کے نیچے آجایا جائے جو دشمن کو قبول ہو۔

مزاحمت: شعور کے ارتقاء اور انحطاط کے درمیان

صہیونیت نے جس وقت ۷۸ فیصدی فلسطینی اراضی پر اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تھا اور ۱۹۴۸ء کی جنگ میں ۶۰ فیصدی وہاں کی آبادی کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، اس وقت عالم عرب، عالم اسلام اور فلسطین کی واحد پکار یہی تھی کہ وہ فلسطین کو آزاد کرائیں گے اور اسرائیل کا وجود صفحہ ہستی سے نابود کر کے دم لیں گے۔ ۱۹۶۴ء میں تحریک آزادی فلسطین کا آغاز ہوا تو اس کا ہدف بھی یہی تھا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کا واقعہ پیش آیا تو عرب دنیا میں ایک الگ نعرے کی گونج سنائی دی کہ ظلم و بربریت کے نشانات مٹا دیے جائیں۔ مغربی کنارے اور جولان، سیناء اور غزہ کو واپس حاصل کیا جائے، اس وقت مکمل فلسطین کی بازیابی نسیان کا شکار ہو گئی یا اس کا شکار بنا دی گئی۔

فتح و نصرت کے شعور یا شعور کے انحطاط کی کیفیت کا شکار ہونے کے درمیان خلط ملط جنگ یا کشمکش کے نتائج کے سبب ہوا کرتا ہے، کبھی کبھی کامیابیوں کے حصول اور دشمن پر اپنے مقاصد کو تھوپنے کے سلسلے میں پرفریب خیالات تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اس وقت جب کہ اپنی اراضی سے پیچھے ہٹنے یا مقصد سے کچھ حد تک دست برداری کا عمل ہوتا ہے، اسی وقت اس پر پردہ ڈالنے کے لیے قومیت میں اضافہ ہوتا ہے، فتح کا سرور ہوتا ہے اور خود اعتمادی کی کیفیت ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزاحمت ختم ہونے کے حالات رونما ہونے لگتے ہیں، ذاتی نقد و احتساب کمزور پڑنے لگتا ہے، سہل الحصول کامیابیوں کے حصول کے لیے دل مچلنے لگتا ہے، اہداف کمزور پڑنے لگتے ہیں اور 'کم تر' کے حصول میں ناکامی کے بعد 'زیریں' کے حصول کی سعی کا مرحلہ آتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ عربوں کی فتح کے طور پر جانی جاتی ہے، باوجود اس کے کہ یہ آخری عرب جنگ تھی اور اس جنگ نے عرب حکومتوں کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا کہ اسرائیل کی شکست یا اس کا خاتمہ ممکنات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے، بطور خاص اس وقت جب کہ امریکی اور مغربی حمایتیں کھل کر اسرائیل کے حق میں آگئیں اور اس سے طاقتوں کا توازن کمزور پڑ گیا۔

اسی طرح جب اکتوبر ۱۹۷۳ء کی کامیابی کے جشن منائے جا رہے تھے، شہر چراغاں کیے جا رہے تھے، ٹھیک اسی وقت عرب حکومتیں اسرائیل کے ساتھ تصفیہ اور اعتراف کے عمل میں مصروف تھیں (جیسا کہ مصر میں سادات نے کیا) اس وقت آزادی کے ہدف کو پورا کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت کامیابی کے جشن منانے چاہئے تھے یا کہ تحریک آزادی سے دستبرداری پر ماتم کرنا چاہئے تھا؟ پھر کیا جو کچھ اس وقت ہوا وہ شعور کا ارتقاء تھا یا کہ شعور کا انحطاط تھا؟

وہ عرب حکومتیں جنہوں نے ۱۹۷۸ء میں مصری حکومت کے سمجھوتے پر دستخط کرنے پر اس کے بائکاٹ کا اعلان کیا تھا اور اسے خائن، ذلیل اور اسرائیلی ایجنٹ کہا تھا، ان حکومتوں نے خود بعد میں تصفیہ کی راہ اختیار کر لی۔

فلسطینی مزاحمت دوستوں کی جانب سے بھی اور دشمنوں کی جانب سے بھی مختلف قسم کے دباؤ، جنگوں اور چیلنجوں کا شکار رہی ہے۔ اس نے شعور کے ارتقاء اور شعور کے انحطاط کے بہت سے مراحل طے کیے ہیں۔

فتح پارٹی اور دوسرے گروپس کا ابتداء میں یہ خیال تھا کہ سرحد پار مزاحمتی کارروائیوں کا جب آغاز ہو جائے گا، تو اسرائیل کے ساتھ اس معرکہ میں عرب حکومتیں خود بخود آ کر شامل ہو جائیں گی۔ لیکن ان کی یہ سوچ بہت جلد ہی ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد تبدیل ہو گئی۔

جب عام ممالک میں گوریلا کارروائیوں کا آغاز ہوا تو عرب حکومتوں کی جانب سے اس کے سامنے سب سے زیادہ رکاوٹیں اور چیلنجز درپیش آئے کیونکہ اس کے سبب ان کو خود اپنی حکومت کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کارروائیوں کو اسرائیل سے زیادہ ان حکومتوں اور مخالف قوتوں نے کمزور بنا دیا۔

ابتدا میں عرب ممالک شعور کے انحطاط کا شکار ہوئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی زمین سے گوریلا کارروائیوں کی اجازت دینے کے نتیجہ میں ان کو کافی مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کیونکہ اس کے نتیجہ میں ان کو کافی تاوان ادا کرنا پڑتا تھا۔ پھر فلسطینی اقتداری شعور کے انحطاط کا شکار ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے خون خرابہ ہو رہا تھا، کشمکش کی صورت پیش آ رہی تھی اور عرب حکومتوں کی جانب سے اس کو کمزور کیا جا رہا تھا۔

تحریک آزادی مستقل تجربات اور پھر مختلف دباؤ جن کے سامنے وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی، اس کے نتیجہ میں یہ منصوبہ بنایا کہ وہ صورتحال کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھائے گی، اس کی دلیل یہ پیش کی گئی کہ جو حقوق فراہم ہیں اور جو مواقع موجود ہیں ان سے بہرہ مند ہو جایا جائے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے زمینی انخلاء کیا، پست ہمتی کا شکار ہوئی اور دشمن کو مزید پیش رفت کا موقع حاصل ہو گیا۔

اسی طرح، فلسطین کی قومی قرارداد کے مطابق جب آزادی کے حصول کے لیے مسلح جنگ کے سوا

کوئی چارہ نہیں رہ گیا، اور دس نکاتی پروگرام کے اعتبار سے (۱۹۷۴ء) اس کو ایک وسیلہ اور راہ کے طور قبول کر لیا گیا نیز اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ کسی بھی جگہ کو دشمن سے آزاد کیا جاتا ہے یا دشمن خود وہاں سے انخلاء کر لیتا ہے تو وہاں فلسطینی نظام قائم کیا جائے گا۔ اس طرح تصفیے کے عمل میں تحریک ایک مزاحمتی وسیلے کے طور پر شریک ہو گئی۔

اس کے بعد تحریک آزادی لبنانی خانہ جنگیوں کے نتیجہ میں کچھ دوں ہمتی اور منافقت کا شکار بن گئی۔ ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کے لبنان کے خلاف اس احتجاج کے سبب لبنان سے ہونے والی فلسطینی گوریلا کارروائیوں کا خاتمہ کر دیا گیا، اس طرح بیرون سے ہونے والی فلسطینی مزاحمت اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

اس سے تحریک کے اندر جو مصالحتی رجحان پایا جاتا تھا اس کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ صورتحال کے ساتھ مزید سمجھوتہ کیا جائے، جس سے اس کے شعور میں مزید انحطاط آیا، اور یہ خیال جگہ بنانے لگا کہ صورتحال کو بدلنے کے لیے کوئی چیلنج نہ کیا جائے، بلکہ اس میں جو مواقع میسر ہیں ان سے مستفید ہوا جائے اور مخالفین کی جانب سے جو چھت اور جو حدود متعین ہیں اسی میں کاروان حیات کو آگے بڑھایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۷ء میں شروع ہونے والے مبارک انتفاضہ کے ساتھ تحریک آزادی نے کوئی تعاون نہیں کیا کہ اس سے آزادی کے سلسلہ میں کچھ حاصل ہو سکے گا بلکہ اس کے ساتھ اس کے اشتراک کی نوعیت یہ تھی کہ اس کو بھی تصفیے کے عمل میں شریک کیا جائے گا۔

اس وقت جب کہ لوگ انتفاضہ کے ماحول میں مدہوش تھے۔ اس وقت نومبر ۱۹۸۸ء میں تحریک آزادی کی جانب سے فلسطینی تاریخ کے سب سے بڑے دستبرداری کے عمل کا ارتکاب ہوا جس کی رو سے پہلی مرتبہ فلسطین کی تقسیم کو تسلیم کیا گیا، نیز امن کونسل کے ۲۴۲ نمبر کے فیصلے کو قبول کر لیا گیا جس کے تحت وہ قضیہ فلسطین کے ساتھ پناہ گزینوں کے قضیہ جیسا سلوک کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلان کیا گیا جو یقیناً سنجیدگی کا طالب تھا، وہ اعلان فلسطین کی آزادی کا اعلان تھا۔

تحریک کی قیادت کرنے والے مصالحتی رجحان نے آخر کار یہ اعلان کر دیا کہ وہ پر امن تصفیہ پر ایمان رکھتا ہے اور تشدد و مسلح جدوجہد کی تردید کرتا ہے۔ خود تحریک کے میثاق میں موجود اصولوں اور سرخ لکیروں سے اس نے سمجھوتہ کر لینے کی راہ اختیار کر لی۔ پھر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ جن بنیادوں پر تحریک کا آغاز ہوا تھا ۱۹۹۶ء میں ۲۱ ویں قومی کونسل میں ان بنیادوں کو بھی دستور کی دفعات سے نکال دیا گیا۔

تحریک آزادی کی قیادت کی سطح پر شعور کے انحطاط کے تین پہلو ہیں:

۱۔ اسرائیل کے ساتھ معاملات، اس کو ایک ایسی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے جس کو بدلنا امکان سے باہر ہے، مزید برآں فلسطین کی بیشتر تاریخی اراضی کے ساتھ سمجھوتہ۔

۲۔ یہ نظریہ اختیار کر لینا کہ جس چیز کو بچانا ممکن ہے اس کو بچانا ہے اور جس چیز کو حاصل کرنا ممکن ہے اس کو حاصل کرنا ہے، اس طور پر کہ زمانہ فلسطین اور عرب دنیا کے حق میں نہیں ہے نیز یہ کہ تصفیہ کے دستر خوان پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جس کا سامنا کل کرنا پڑ سکتا ہے۔

۳۔ اس بات کا احساس کہ مسلح مزاحمت، انقلابی اقدام اور انتفاضہ کی تحریکات سے فلسطینی قوم کے حقوق کی بحالی، طاقت و قوت کے معیار کی تبدیلی اور اسرائیل کو انخلاء پر مجبور کرنے کے سلسلہ میں کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

فلسطینی صدر محمود عباس اور اس کا گروپ اس فکر کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں جن کا یہ ماننا ہے کہ مسلح جدوجہد سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، نیز جو مسلح جدوجہد جاری ہے یہ کار عبث ہے جو خطرناک نتائج سے دوچار کر سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تصفیہ اسٹریٹجی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے اور یہ کہ تصفیہ کا بدل خود تصفیے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے برعکس شعور کے انحطاط کی اس ناگفتہ بہ صورتحال کے بالمقابل، فلسطینیوں کے شعور میں ارتقاء موجود بھی ہے، جس کے سبب وہ عالم اسرائیل کے مدمقابل ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ خواہ حالات کچھ بھی ہوں اپنے وطن سے چپکے رہنا اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا۔ ہجرت اور ترک وطن سے انکار کر دینا۔ باوجود اس کے کہ متعدد خونریز معرکے ہوئے، گھروں کو منہدم کیا گیا اور نہ جانے کیا کیا حرکتیں ہوئیں لیکن وطن میں قیام پر مصر رہنا۔

۲۔ اس بات کی ضرورت کا ادراک کر لینا کہ جدوجہد خود انہیں کی ذمہ داری ہے اور آزادی فلسطین سے تعلق سے عرب و اسلامی دنیا کا فیصلہ آنے کے انتظار میں وقت نہ ضائع کرنا، بلکہ خود ہی محاذ پر جم جانا۔

۳۔ فلسطین کے اندرون سے ہونے والی مزاحمت کی اہمیت کو محسوس کر لینا اور مزاحمت کو بیرون سے اندرون منتقل کر لینا جبکہ ان کو سرحدوں میں محصور کر دیا گیا ہے۔

۴۔ مزاحمت میں نئے نئے وسائل کا استعمال کرنا، راکٹ وغیرہ کو اپ ڈیٹ کرنا نیز تمام ہی سیاسی، سماجی اور میڈیا کے ذرائع کو مزاحمت کے لیے استعمال کرنا۔

لیکن موجودہ مزاحمتی گروپس بطور خاص حماس اور حزب اللہ کو شعور کے انحطاط کے مظاہر میں پڑنے سے بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اس بات کو جان لینے پر کہ دشمن کس طرح بے دریغ قوتوں کا استعمال کر رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں کس طرح بڑے پیمانے پر قتل و غارت ہو رہی ہے۔

۲۰۰۶ء میں اسرائیل کی لبنان مخالف جنگ میں شکست کے باوجود جب کہ تحریک مزاحمت کو اس میں بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے، اسرائیل کو جنگ کا ایک ہدف معلوم ہو گیا ہے کہ سرحد پار مزاحمت کی جانب سے کوئی بھی سخت کارروائی آسان ہے، اب اس جنگ کے بعد وہ اس قسم کی حرکت کرنے سے قبل متعدد بار سوچنے پر مجبور ہوگا۔

یہی معاملہ حماس کے ساتھ بھی ہے، اس نے ابتداء ہی سے کسی مستقل مصالحت سے انکار کیا تھا اور متعینہ شروط اور متعینہ مدت ہی کے لیے کسی مصالحت پر آمادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹ دسمبر ۲۰۰۸ء میں جوں ہی شش ماہی معاہدہ کا وقت پورا ہوا، روزانہ ۵۰ سے ۶۰ کے بیچ راکیٹ اسرائیل پر داغے گئے کہ وہ حصار بندی ختم کرے اور اس طرح مزاحمت کے اپنے حق کو اس نے استعمال کیا۔

یہ الگ بات ہے کہ جب سے ۲۰۰۸ء کے اواخر اور ۲۰۰۹ء کے اوائل میں ہونے والا اسرائیلی جارحانہ حملہ اپنے مقاصد میں ناکام ہوا اور مزاحمت نے یہ ثابت کر دکھایا کہ طاقت کے زور پر ان کو ترک وطن پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے، غزہ کا علاقہ ایک غیر متعین عملی مصالحت میں داخل ہو گیا ہے اور حماس و دیگر مزاحمتی گروپس نے حصار بندی کے خاتمہ کے لیے راکٹوں کا استعمال بھی ترک کر دیا۔

لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس واقعہ کے ذریعہ بھی اسرائیل نے اپنے ایک مقصد میں کامیابی حاصل کر لی، وہ یہ کہ غزہ میں اس نے اپنے محاذ کو پرامن بنا لیا ہے، دس لاکھ اسرائیلیوں کو جو راکٹ کا نشانہ بن جانے کا خطرہ ہمہ وقت لاحق رہتا تھا اس سے اب اطمینان حاصل ہو گیا ہے حالانکہ اس نے حصار بندی ختم نہیں کی ہے۔

شعور کے انحطاط سے تحفظ

یہ موضوع غور و فکر کا ہے کہ وہ کیا امور ہیں جن کی رعایت کی جائے تو تحریک مزاحمت کو شعور کے انحطاط کے دام فریب میں پھنسنے سے بچایا جا سکتا ہے؟ شائد کہ یہ بعض نکات اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوں:

☆ اصولوں اور اعلی مقاصد کو مضبوطی کے ساتھ گرہ کر لیا جائے کہ کسی تبدیلی یا سمجھوتہ کا امکان باقی نہ رہے۔

☆ اس بات کی کھلی چھوٹ ہو کہ اپنا احتساب ہوتا رہے، سرگرمیوں کی نگرانی ہو اور کوتاہیوں پر محاسبہ ہو۔

☆ بحیثیت مجموعی امت کی نبض سے قریب ہو کر رہا جائے، ان کی دشواریوں اور ان کی امنگوں کا علم ہو۔

☆ بعض سہل الحصول کامیابیوں سے دھوکہ نہ کھایا جائے جیسے روابط اور سیاسی تعلقات وغیرہ اور بعض مادی تعاون کی شکلیں ہیں جو قیمت دے کر حاصل کی جاتی ہیں۔

☆ فراہم کردہ حقوق اور مبلک پھندوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھا جائے۔ جیسے کہ یہ شعار ہے کہ زرد قبضہ میں ہے۔ آزادی سے قبل اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ دشمن یا خارجی قوتوں کی مدد سے وطن کی اندرونی مخالف قوت کے ساتھ صلح مصالحت کرنی ہے۔

☆ دشمن کے کمزور پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں، اس کی سماجی، اقتصادی، عسکری اور سیاسی بنیادوں میں موجود شگافوں پر ہاتھ رکھنا ہے اور ان شگافوں کو سامنے رکھتے ہوئے کس طرح دشمن پر یلغار کرنی ہے اور اس کے لیے کیا کیا وسائل درکار ہیں۔ اس بات کا علم کہ دشمن بھی بہت سے مسائل اور بحران کا شکار ہے، کہ اگر ہم مشکلات کا شکار ہیں تو کیا بات، وہ بھی تو مشکلات سے دوچار ہیں، جیسا کہ سورہ آل عمران میں مذکور ہے۔ بہر صورت اس چراغ کو گل ہونے سے بچانا ہے جو انقلاب اور وطن کی آزادی کا اشارہ دیتا ہے خواہ کتنے ہی دن لگیں اور کتنی ہی نسلیں درکار ہوں۔ آخری بات یہ کہ نفسیاتی طور پر شکست سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے، عزت اور سر بلند رہنا ہے، حق و انصاف کی جدوجہد کرنا ہے۔ دشمن کو اس بات کا موقع نہیں ملنے دینا ہے کہ فکری اور نظریاتی بنیادوں میں کوئی خلل پیدا کر سکے، اصولوں میں کوئی دراڑ ڈال سکے اور امیدوں کے روشن چراغ گل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

☆

تبلیغ دین کے چند اہم اصول

اعجاز احمد قاسمی☆

تبلیغ دین کی اہمیت و فرضیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فرمائی اور اس کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز کی قابلیت وصلاحیت نیز نیکی اختیار کرنے اور بدی سے احتراز کی خواہش ودیعت فرمادی۔

ارشاد خداوندی ہے: ونفس و ما سوىها. فالهمها فجورها و تقوىها. (سورہ شمس: ۷، ۸)
"قسم ہے نفس کی اور اسے درست بنانے کی، پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی"
دوسرے مقام پر ارشاد ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورہ تین: ۴)
"یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔" اس آیت کے تفسیری حاشیے میں مولانا صلاح الدین یوسف فرماتے ہیں:

> یہ جواب قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کا منھ نیچے کو جھکا ہوا ہے۔ صرف انسان دراز قامت، سیدھا بنایا ہے جو اپنے ہاتھوں سے کھاتا پیتا ہے، پھر اس کے اعضاء کو نہایت تناسب کے ساتھ بنایا۔ ان میں جانوروں کی طرح بے ڈھنگا پن نہیں ہے۔ ہر اہم عضو دو دو بنائے اور ان میں نہایت مناسب فاصلہ رکھا پھر اس میں عقل و تدبر، فہم، حکمت اور سمع و بصر کی قوتیں ودیعت کیں۔ دراصل یہ انسان اللہ کی قدرت کا مظہر اور اس کا پرتو ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کو بھی اسی معنی و مفہوم پر محمول کیا ہے، جس میں ہے کہ "ان اللہ خلق آدم علی صورتہ" (مسلم کتاب البر والصلہ) اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔

اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو انسان ایک اعلیٰ خلقت اور بلند فطرت لے کر آیا ہے۔ جس کا تقاضا ہے کہ اگر وہ اپنی عقل و فہم سے نیکی اختیار کرے تو عند اللہ ماجور ہو اور بدی کا ارتکاب کرے تو ماخوذ ہو۔

☆ استاذ حدیث و فقہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے انسان کی ہدایت وضلالت اور ماجوریت اور ماخوذیت کا معاملہ تنہا اس کی فطرت پر نہیں چھوڑا بلکہ فطرت کے تقاضے کو آشکارا کرنے اور خلق پر اتمام حجت کے لیے انبیائے کرام کی بعثت کا ایک سلسلہ شروع فرمایا تا کہ روز قیامت کوئی شخص یہ عذر نہ کر سکے کہ اسے نیکی کا راستہ معلوم نہیں تھا۔

اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے:

ارشاد ہے: رسلا مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ الحجة بعد الرسل وکان اللہ عزیزا حکیما. (سورہ نساء: ۱۶۵)

اور ہم نے بھیجے ایسے رسول جو خوشخبری دیتے اور ہوشیار کرتے ہوتے تاکہ لوگوں کے پاس ان رسولوں کے بعد اللہ کے خلاف کوئی دلیل اور حجت باقی نہ رہے۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: یا اهل الکتاب قد جاءکم رسولنا یبین لکم علی فترة من الرسل ان تقولوا ماجاءنا من بشیر و نذیر واللہ علی کل شیء قدیر "اے اہل کتاب انبیاء کے ایک وقفے کے بعد ہمارا رسول تمھارے پاس دین حق کو واضح کرتے ہوئے آیا ہے تاکہ تم یہ عذر نہ کرسکو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس مضمون کی اور بھی متعدد آیات مبارکہ قرآن مقدس میں موجود ہیں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے اور ہر قوم میں نبی اور رسول بھیجا اور مزید کرم یہ کیا کہ ہر قوم میں اسی میں سے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے قبول حق میں مانع نہ ہو۔ یہ طریقہ اس وقت تک باقی رکھا گیا جب تک دنیا میں تمدنی اور اجتماعی زندگی نے بھرپور ترقی نہیں کرلی۔ لیکن جب انبیائے کرام کی تعلیم وتربیت سے قوموں کا اخلاقی واجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالم گیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کرسکیں اور اس کے ساتھ ہی تمدنی اور اجتماعی زندگی نے اس قدر ترقی کرلی کہ ایک ہادی کا پیغام دنیا کے ہر گوشے تک بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ وہ نظام زندگی عنایت فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے مطابق ہو۔ گویا انبیائے سابقین کی تعلیمات مخصوص اقوام کے مزاج اور حالات کے موافق ہوا کرتی تھیں لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جملہ انسانیت کے مزاج اور اس کی ضروریات وحالات سے مطابقت رکھتی ہیں۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چوں کہ تمام عالم کی ہدایت ورہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمام حجت کی

ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو قسم کی بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا: ایک بعثت خاص اور دوسری بعثت عام۔

آپ کی بعثت خاص تو عرب کی نسبت ہوئی تھی اور بعثت عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ بعثت خاص کی ذمہ داریاں تو بحسن وخوبی آپؐ نے براہ راست انجام دے دیں البتہ عام ذمہ داریوں کی انجام دہی آپ کی امت کے سر ڈال دی گئی۔ ارشاد خداوندی ہے: وکذالک جعلنکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا. "اسی طرح ہم نے وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے"

دوسرے مقام پر فرمایا: واوحی الی هذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ "اور اس قرآن کی وحی آئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو ہوشیار کروں اور جن کو یہ پہنچے۔"

پوری دنیا پر اتمام حجت کا فریضہ چوں کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم کے سپرد کیا گیا تھا اس لیے اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو خاص انتظام فرمادیے۔

ایک یہ کہ قرآن مجید کو جو اس دین کا منبع اور سرچشمہ اصلی ہے اسے ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ فرمادیا تاکہ دنیا والوں کو اللہ کی ہدایت اور مرضیات معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

دوسرا انتظام یہ فرمایا کہ اس میں سے ایک گروہ کو ہمیشہ کے لیے حق پر قائم کردیا۔ فرمان رسولؐ ہے: لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خالفهم (الحدیث) "کہ میری امت میں سے ہمیشہ ایک جماعت حق پر عمل پیرا رہے گی، ان کے مخالفین ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔"

یہ انتظام اللہ نے اس لیے فرمایا تاکہ جو لوگ واقعی حق کے طالب ہیں ان کے لیے ایک نمونہ ہمیشہ باقی رہے اور ان کا علم وعمل ہمیشہ مشعل راہ کا کام دے سکے اور آخرت میں لوگ اللہ کے سامنے کسی قسم کا عذر نہ پیش کرسکیں۔

اس تفصیل سے تبلیغ دین کی اہمیت وفرضیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور ان تفصیلات سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تبلیغ دین صرف ایک نیکی اور دینداری کے طور پر مطلوب نہیں ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کے لیے مطلوب ہے بلکہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مطلوب ہے۔ گویا یہ تبلیغ دین کا فریضہ فریضہ رسالت ہے، جو آنحضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے۔ یعنی جو مسلمان تبلیغ دین میں کوتاہی کرے گا گویا وہ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا۔

اگر یہ امت اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گی اور اتمام حجت کا فریضہ پورا نہیں کرے گی تو دنیا اللہ کے سامنے اپنی گمراہی اور کجروی کے لیے یہ عذر پیش کر سکتی ہے کہ اے اللہ تو نے جس امت پر شہادت حق اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی تھی اس نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی۔ ظاہر ہے اس وقت یہ امت اس الزام کو مسترد نہیں کر سکے گی۔

تبلیغ دین سے پہلو تہی کے نقصانات

تبلیغ سے پہلوتہی کے نقصانات بے شمار ہیں۔ ان میں چند اہم نقصانات درج ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلا نقصان یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر انسان فریضہ رسالت کی اہم ذمہ داری انجام دینے سے قاصر رہ جاتا ہے جو ایک ناقابل معافی جرم ہے اور آخرت میں دوسری اقوام کے سامنے جواب دہی اور شرمندگی کا باعث ہے۔

(۲) ہلاکت و تباہی میں مشارکت: چنانچہ بخاری شریف کی ایک روایت ہے جو حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور ان کو توڑنے والے کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جنھوں نے قرعہ اندازی کر کے ایک کشتی کے حصے آپس میں بانٹ لیے۔ ان میں سے بعض کو اوپر کا حصہ ملا اور دوسروں کو نیچے کا۔ وہ لوگ جو کشتی کے نچلے حصے میں تھے انھیں جب پانی لینا ہوتا تو وہ اوپر والوں کے پاس سے گزرتے۔ انھوں نے سوچا ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ بس وہ کہنے لگے کہ اگر ہم اپنے حصے میں شگاف کر لیں اور شگاف کے ذریعہ پانی لے لیا کریں اور بار بار اوپر جا کر اوپر والوں کو تکلیف نہ دیں تو اچھا ہے۔ اب اگر انھیں اوپر والے ایسا کرنے سے نہ روکیں گے اور انھیں چھوڑ دیں گے کہ اپنا یہ خطرناک ارادہ پورا کر لیں تو شگاف کے ذریعہ کشتی میں پانی بھر آئے گا اور اسے ڈبو دے گا اور پھر سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اوپر والے ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے اور انھیں شگاف کرنے سے روک دیں گے تو خود بھی بچ جائیں گے اور باقی سب نجات پا جائیں گے۔

کفر و شرک اور بداعمالیوں کو اپنانے والے درحقیقت اس دنیا کی بربادی کا بندوبست کر رہے ہیں اگر حق پرست لوگ برائیوں میں مبتلا انسانوں کو برائیوں سے روکنے اور راہ راست پر لانے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ان کی بداعمالیوں کے باعث جب دنیا میں مختلف اقسام کے فساد پھیلیں گے اور علاقے تباہ ہوں گے تو اس سے صرف وہی لوگ مبتلائے مصیبت نہیں ہوں گے جو برائیوں میں مبتلا تھے

بلکہ وہ نیکوکار لوگ بھی ہلاکت و بربادی میں شریک رہیں گے جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب تو نہیں کیا تھا لیکن ان کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس مضمون کی اور بھی حدیثیں ذخیرہ احادیث میں ملتی ہیں۔ اس مضمون کی تائید قرآن پاک کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ واعلموا ان اللہ شدید العقاب ”اور تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص کر صرف انہی لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں سے ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“ (انفال: ۲۵)

اسلام کی مقبولیت میں کمی:

تبلیغ دین سے پہلوتہی کے نقصانات میں سے ایک عظیم نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام کی مقبولیت و اشاعت میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی شئی فی نفسہ کتنی ہی اچھی اور مفید کیوں نہ ہو اسے دنیا میں پھیلانے کے لیے ہمیشہ دنیا والوں سے تعارف کرانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے سامنے اس کی خوبیاں اور فوائد بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ، اسلام کے لیے سرچشمہ قوت ہے جس سے اسلام کو تقویت، طاقت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔

ابتدائی صدیوں میں اسلام کی تیز نشر و اشاعت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسلاف نے دوسرے امور دنیوی کے ساتھ دین کی تبلیغ پر بھی محنت کی۔ بعد کے ایام میں جوں جوں اس میں کمی آتی گئی اسی قدر مقبولیت میں بھی کمی واقع ہوتی رہی۔

تبلیغ دین کے سلسلے میں ہدایات:

قرآن و حدیث کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی اہمیت ہے چنانچہ قرآن پاک کی متعدد آیات میں اس کا واضح حکم موجود ہے۔ چند آیات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سورہ آل عمران میں ارشاد خداوندی ہے: ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون ”تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے کہ جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں۔“ (آل عمران: ۱۰۴)

(۲) کنتم خیر امۃ أخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(۳) ترمذی شریف کی ایک روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ضرور نیکی کی طرف دعوت دیتے رہنا اور ضرور برائی سے روکتے رہنا ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور تم پھر اس سے دعائیں کرو لیکن وہ قبول نہ ہوں۔

(۴) حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا شہرہ آفاق خطبہ ارشاد فرمایا تو مسلمانوں کو یہ نصیحت بھی فرمائی:

لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسیٰ أن یبلغ من ھو اوعی له فیه "چاہئے کہ جو حاضر ہے وہ میرے ان احکام کو اسے پہونچادے جو حاضر نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حاضر انہیں ایسے شخص تک پہونچادے جو انہیں پہونچانے والے سے زیادہ محفوظ رکھے۔" (بخاری)

اس مفہوم کی متعدد روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں جن سے دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعلق سے واضح ہدایات ملتی ہیں۔

تبلیغ کا طریقۂ کار:

تبلیغ کے طریقۂ کار کو کماحقہٗ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تبلیغ کے خارجی اور داخلی وسائل سمجھ لیے جائیں۔ ذیل میں اولاً خارجی وسائل اور ثانیاً داخلی وسائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

تبلیغ کے خارجی وسائل:

خارجی وسائل تو بے شمار ہیں البتہ ان میں سے دو اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱:- حذر:

یعنی داعی کو فریضۂ دعوت کی ادائیگی میں انتہائی احتیاط، تحفظ اور بیدار مغزی سے کام لینا چاہئے۔

قرآن و سنت میں حذر کی مشروعیت پر بے شمار دلائل ہیں:

(۱) مثلاً سورہ نساء کی آیت ۱۰۲: واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلاۃ فلتقم طائفة منھم معک ولیاخذوا اسلحتھم فاذا سجدوا فلیکونوا من ورائکم ولتات طائفة أخریٰ لم یصلوا فلیصلوا معک ولیاخذوا حذرھم واسلحتھم..... الآیہ "جب تم ان میں ہو اور ان کے لیے نماز کھڑی کرو تو چاہئے کہ ان

کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لیے کھڑی ہو پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو ہٹ کر تمہارے پیچھے آجائیں اور دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آجائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہے۔"

(۲) یاایھا الذین آمنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات أو انفروا جمیعا (سورہ نساء: ۷۱) "اے مسلمانو! اپنے بچاؤ کا سامان لے لو پھر گروہ گروہ بن کر کوچ کرو یا سب کے سب اکٹھے ہو کر نکل کھڑے ہو۔"

سنت میں تو اس کی بے شمار مثالیں ہیں:

(۱) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت سے قبل ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر دوپہر کے وقت آنا۔ ارادۂ ہجرت ظاہر کرنے سے قبل گھر کے افراد کو اپنے پاس سے نکال دینے کا مطالبہ کرنا۔ دونوں کا گھر میں پشت والے دروازے سے نکلنا۔ غار ثور میں چھپنا اور پناہ لینا یہ سب حذر و احتیاط کی مشروعیت پر واضح دلیل ہیں۔

(۲) فتح مکہ سے قبل مکہ میں رہنے والے اصحاب کرام کا گھاٹیوں میں جاکر چوری چھپے نماز ادا کرنا بھی حذر کی مشروعیت کی دلیل ہے۔

حذر و احتیاط کا خلاصہ یہ ہے کہ بطور خاص مدعو علاقے میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے انتہائی احتیاط اور بیدار مغزی سے کام لینا چاہئے اور اس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مثلاً ایسے افراد کی تلاش و جستجو جو اس اہم کام میں تعاون کر سکیں یا کم از کم دشمنوں سے حفاظت کا ذریعہ بن سکیں۔ جب کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اولاً انہی لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جن سے ان کے کامل اعتماد و تعلقات تھے اور جن کا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔

(۲) اسی طرح اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا تبلیغ کے حوالے سے اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دینا۔

(۳) قوم کے افراد سے زیادہ میل جول نہ رکھنا۔

(۴) اگر ایک جگہ کی فضا دعوت کے لیے سازگار نہ ہو تو دوسری نسبتاً مامون و محفوظ جگہ منتقل ہو جانا۔

(۵) اگر کفار و مشرکین کی طرف سے ایذا رسانی کا خطرہ ہو تو اپنے ایمان بلکہ اپنے نام کو بھی ظاہر نہ کرنا۔ جب کہ مقام بدر کی جانب جاتے جاتے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں سے دور نکل گئے، راستے میں ایک بوڑھے شخص سے ملاقات ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قریش کے حالات پوچھے اس نے بتا دیئے پھر اس نے دونوں سے پوچھا "من انتما" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "نحن من ماء" بیعت عقبہ اولی اور ثانیہ کے واقعات بھی اس بات کی صحت پر شاہد عدل ہیں۔

(۶) اگر پلان ایک سے زائد ہوں تو ان کا ایک دوسرے سے علی حدہ رہنا اور کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جو کفار کی توجہات اس کی طرف کھینچ لے۔

(۷) داعی کا اپنے قصد و ارادہ اور اس کی تفصیلات کو مخفی رکھنا جیسا کہ غزوات کے مواقع پر آپ کا معمول ہوا کرتا تھا۔

۲:- استعانت بالغیر:

دوسرا وسیلہ استعانت بالغیر ہے یعنی داعی کو فریضہ دعوت کی ادائیگی میں جدید ذرائع ابلاغ کے ساتھ دوسرے اہل خیر افراد سے بھی مدد لینی چاہئے اور ان کی پناہ اور حفاظت میں آنے کو اپنے لیے باعث عار نہیں سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم موسم حج میں اپنے آپ کو قبائل عرب پر پیش کیا کرتے تاکہ کوئی قبیلہ ان کی حفاظت کا ذمہ قبول کرلے تاکہ پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اللہ کا پیغام دنیا والوں کو پہونچا سکیں۔

بلکہ اس سلسلے میں اعتدال پسند کافروں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے چنانچہ حضرت ابوطالب کافر و مشرک ہونے کے باوجود آنحضور کی حمایت و حفاظت فرماتے۔ اسی طرح طائف سے واپسی کے بعد آپ نے مطعم بن عدی کی امان حاصل کی۔

البتہ اس کا خیال رکھا جائے کہ کفار کی یہ مدد دین اسلام کے کسی فریضے یا کسی ادنی سے ادنی حکم کی قیمت پر نہ ہو۔

تبلیغ کے داخلی وسائل:

تبلیغ کے داخلی وسائل تین ہیں۔ قول، عمل اور سیرت و کردار کی پختگی:

۱:- تبلیغ بالقول: دعوت و تبلیغ میں تبلیغ بالقول اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کریم جو سب سے بڑا ذریعہ تبلیغ ہے وہ قول ہی ہے۔ انبیائے سابقین نے بھی زیادہ تر قول کے ذریعہ ہی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہے۔

لہذا تبلیغ کے حوالہ سے داعی کو قول کی اہمیت سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ کلام داعی کو مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے۔

(۱) داعی کا کلام انتہائی واضح اور سہل المراد ہونا چاہئے۔ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور ابہام نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام انتہائی واضح اور ظاہر ہوا کرتا تھا جو بھی اسے سنتا سمجھ لیتا۔

(۲) داعی کے کلام میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہونا چاہئے جس میں حق و باطل، صحیح و غلط دونوں کا احتمال ہو۔ داعی کو حتی الامکان ایسے الفاظ شرعیہ کا استعمال کرنا چاہئے جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں۔ اس نکتہ کی جانب قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے "یا ایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا و قولوا انظرنا"

(۳) داعی کو اطمینان کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہنی چاہئے۔ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے تاکہ سننے والا مکمل طور پر اس کی بات سمجھ سکے۔ بخاری شریف کی روایت ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا تکلم بکلمۃ أعادھا ثلاثا حتی تفھم عنہ.

(۴) داعی کو تکلف اور بناوٹ سے پرہیز کرنا چاہئے۔

(۵) داعی کے اندر نصیحت اور خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہئے اور اسی جذبہ سے خطاب کرنا چاہئے۔ اپنی بڑائی اور فضیلت کا اظہار اور مدعو کی تحقیر مقصود نہ ہو۔

(۶) داعی کو گفتگو میں لطف اور نرمی پیدا کرنا چاہئے جس سے مدعو کے اندر سننے کا جذبہ بیدار ہو۔

۲:- تبلیغ بالعمل:

دعوت و تبلیغ کا دوسرا وسیلہ عمل ہے اور اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تبلیغ بالعمل کا مفہوم یہ ہے کہ منکر کے ازالے کی عملی کوشش کی جائے اور معروف کی اقامت اور ترویج عملا کی جائے۔

اس کی اصل یہ حدیث پاک ہے: من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ (الحدیث) البتہ ازالہ منکر میں بھی انتہائی حکمت و مصلحت اور رفق و نرمی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۳:- تبلیغ بالسیرۃ الحسنۃ:

دعوت و تبلیغ کے حوالے سے سیرت و کردار کی پختگی اور عمدگی کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ لوگوں کو اسلام کی جانب کھینچنے کا سب سے اہم وسیلہ ہے، داعی کی سیرت، اس کے افعال و اخلاق جتنے بہتر ہوں گے اسی قدر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ کیونکہ لوگ افعال و سلوک سے جتنا متاثر ہوتے ہیں اتنا کلام سے بھی نہیں ہوتے۔

اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں مسلمانوں کی مومنانہ سیرت سے متاثر ہو کر لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

لہٰذا داعی کے اندر دو چیزیں بطور خاص پائی جانی چاہئیں۔ ایک تو حسن اخلاق اور دوسرے قول و فعل کا تطابق۔ اگر داعی کے قول و فعل میں تضاد ہے تو اس کی بات موثر نہیں ہو سکتی۔ اس کی تبلیغ سے اسلام کو فائدہ کے بجائے نقصان ہی ہو پہنچے گا: ارشاد خداوندی ہے یاایھا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند اللہ أن تقولوا مالا تفعلون۔

اس لیے داعی کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے قول و فعل میں مطابقت اور یکسانیت رہے۔

☆☆☆

حکیم محمد اکبر ارزانی اور ان کی طبی خدمات ☆

ڈاکٹر عبدالباری فلاحی *

خصوصیات:

حکیم ارزانی کی کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باکمال شخص تھے۔ انھیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنی کتابوں میں فارسی لکھتے تھے، عربی عبارتیں بھی بڑی روانی سے لکھتے تھے۔ ان کی کتابوں میں کثرت سے قدماء کی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جن سے ان کی وسعت نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں صرف مجربات ہی نہیں نظر آتے جیسا کہ اس دور کی تالیفات میں نظر آتا ہے بلکہ انھوں نے مرکبات پر ایک مستقل مجموعہ (قرابادین قادری) تیار کیا اور دوسری طرف ماہیت امراض کی ایک شاخ حدود الامراض پر ایک کتاب لکھی۔ معالجات میں شرح اسباب وعلامات جیسی کتاب کو اساس بنا کر طب اکبر لکھی اور کلیات کے موضوع پر مفرح القلوب لکھی۔

حکیم ارزانی نے طب ہندی کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ طب ہندی سے اخذ و قبول میں انھوں نے بڑی احتیاط کا ثبوت دیا۔ جہاں انھوں نے ویدک نظریات کو رد کیا وہاں دلائل و براہین سے ثابت کیا۔

حکیم ارزانی نے اطباء متقدمین سے بھی اختلاف کیا ہے اور بڑی جرأت کے ساتھ کیا ہے۔ تپ خمس کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔ [1]

> "بعض قدماء نے تپ خمس اور اس سے زیادہ دنوں کی باری کے بخار کا انکار کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انکار مناسب نہیں ہے کیونکہ انکار کی گنجائش نہیں ہے اور اکثر اطباء کے مشاہدے میں اس قسم کے بخار آئے ہیں اور اس درویش (ارزانی) نے پندرہ روزہ باری کا بخار بھی دیکھا ہے۔ کئی مہینہ اس باری کی ٹوہ میں رہا اور بغیر کمی بیشی کے ٹھیک پندرہویں دن باری آتی تھی اور جیسا کہ اس بخار کے منکر کا خیال ہے اتفاق کا کوئی احتمال نہ تھا"۔

☆ تسلسل کے لیے سابقہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء ملاحظہ فرمائیں۔

* استاذ شعبہ کلیات، فیکلٹی آف میڈیسن (یونانی)، جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر، نئی دہلی۔ ۶۲

آنکھوں کی ایک بیماری سبل سے متعلق شیخ ابن سینا پر بھی تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں: [2]

"جان لو، اطباء نے سبل کے سلسلے میں تحقیق کا حق ادا نہیں کیا حتیٰ کہ شیخ جیسے جلیل القدر طبیب نے بھی"۔

ضعف ہضم کی حد (تعریف) کے سلسلے میں بھی اعتراض کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: [3]

"لایخفی انما ذکر بعض الافاضل حیث قال ضعف الهضم هو ان لا ینحدر الطعام عن المعدة سریعاً بل یبقی بها اطول من العادة لیس الامن لوازمه."

"یہ مخفی نہیں رہنا چاہئے کہ بعض فضلاء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ ضعف ہضم کی تعریف یہ ہے کہ کھانا عادت سے زیادہ دیر تک معدے میں رہے، جلد آگے نہ بڑھے تو یہ ضعف ہضم کی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے"۔

یہ اعتراض نجیب الدین سمرقندی پر ہے کیونکہ اس طرح کی عبارت ان کی کتاب شرح اسباب میں ملتی ہے۔

"هو ان لا ینحدر الطعام عن المعدة سریعاً بل یبقی فیها اطول من العادة"۔ [4]

طب ہندی کے بعض معمولات بھی کئی مقامات پر زیر بحث آئے ہیں۔ حکیم ارزانی کا رویہ اس سلسلے میں ناقدانہ رہا ہے اور ان کا رجحان طب قدیم کی طرف ہے مثلاً تپ لرزہ میں دہی کا استعمال کیا جائے یا نہیں؟ وہ لکھتے ہیں:

بدانند کہ جغرات نزد اہل ہند جہت تپہائے لرزہ مفید است ولیکن چوں اطباء یونان لبنیات را در حمیات منع کردہ اند فقیر عوض جغرات شربت تمر ہندی یا خشکہ گاہ با نان غذا فرمودہ و نافع یافتہ۔

ویدوں کے نزدیک تپ لرزہ میں دہی مفید ہے۔ لیکن چونکہ اطباء یونان دودھ اور اس کی مصنوعات سے بخاروں میں پرہیز کرواتے ہیں اس لیے میں نے بخار کے مریضوں کو جغرات کے عوض شربت ہندی خشکے کے ساتھ اور کبھی نان کے ساتھ غذا کے طور پر استعمال کروایا اور مفید تر پایا۔ [5]

ویدوں میں کئی ادویہ کے استعمال کا جو عام رواج ہے اس پر حکیم ارزانی نے اپنا نقطہ نظر محتاط انداز میں بیان کیا ہے۔

وبدانند مردار سنگ از جملہ سموم ست و اہل یونان از تناول اجتناب تمام دارند لیکن

اہل ہند در اکثر امراض بلا وسواس می دہند و چوں روغن مصلح وی است و بے مصلح ہرگز نہ دہند مضرت ہم نمی رساند و مع ذالک از دواء غیر کی کار بر آید استعمال این در مزاج پاک طبعان نشاید۔

"مردار سنگ سمیات میں سے ہے اور اطباء یونان اس کو براہ راست استعمال سے سخت احتراز برتتے ہیں لیکن اہل ہند اکثر امراض میں استعمال کرواتے ہیں اور چونکہ گھی اس کا مصلح ہے اور بغیر مصلح کے اس کو کبھی کھلاتے ہیں مردار سنگ بھی مضرت نہیں پہنچاتا ہے لیکن اس کے باوجود احتیاط کا تقاضا ہے کہ جب تک غیر کی دوا سے کام نکل سکتا ہو نازک مزاجوں میں یہ استعمال نہ کرائیں۔ [6]

ایک مقام پر تمام سمیات سے متعلق اپنا انداز فکر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"وآنچہ ذی سموم بشد و اگرچہ سمیت او اصلاح یافتہ باشد و تجارب بے مضرت مشہور شدہ، ترک استعمال او احوط دانند کہ دانایاں و مہران ذی ہوش چنیں مقرر کردہ واین درویش نیز عمرے در تجارب صرف کردہ و محض بہر حال امتحان غور محض تمام دوایہا بر مبذول داشتہ لیکن استعمال ادویہ سمیہ مصلحہ در بعض اشخاص باوجود سزاوار بودن مزاج آں با بدان خالی از مضرت نیافتہ و جائے بعجلت و جائے بتاخیر و ہر امری کہ دراں شائبہ خوف بود ترک او اولی است کما لا یخفی علی احد۔

جو دوائیں سمی ہیں گرچہ ان کی سمیت کی اصلاح کردی گئی ہو اور تجربہ سے بے ضرر بھی مشہور ہوں لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ انہیں استعمال نہ کیا جائے کیونکہ باہوش تجربہ کاروں اور داناؤں کی یہی ہدایت ہے۔ میں نے بھی تجربات میں ایک عرصہ گزارا ہے اور تحقیق کی خاطر اس موضوع پر بہت غور وفکر کیا ہے لیکن میں نے بعض مزاجوں میں کئی ادویہ کو باوجودیکہ وہ ان کے مزاج کے موافق تھیں، کبھی جلد اور کبھی دیر سے ضرر رساں ہی پایا اور جس چیز میں خوف کا گمان ہو اس کو ترک کردینا ہی مناسب ہے۔ [7]

حکیم ارزانی نے اپنی کتابوں میں اپنے مطب کی بعض حکایات بھی درج کی ہیں ان میں سے بعض یہاں بیان کی جارہی ہیں۔

(۱) دحاۃ لسان کے ایک خاص علاج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی زبان کے نیچے ورم آگیا تھا، اور درد بہت شدید

تھا اور مرہمی بلیلن اور متعدد غرغروں سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ مریض سے گفتگو کرنا بھی دشوار تھا۔ چنانچہ میں نے اس ورم پر مبضع سے شگاف لگوایا۔ اس میں چھوارے سے بڑا (طول اور حجم دونوں میں) ایک پتھر نکلا جو سخت تھا اور اس کے نکلتے ہی مریض کو سکون ہو گیا۔ ۸

(۲) عظم راس کے ایک مریض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ایک بچے کو دیکھا جس کا سر اتنا بڑا ہو گیا تھا جیسے بڑا تربوز۔ جب تک کوئی شخص اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام نہ لیتا، دو سر کے وزنی ہونے کی وجہ سے اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا''۔

(۳) ارزانی نے چیچک کے علاج میں ایک اجتہاد کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

''میرے بیٹے شکر اللہ کو چیچک نکل آئی۔ چیچک سخت تھی۔ دانوں میں سوزش کی وجہ سے بچہ بہت بے تاب رہتا تھا میں نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ سونے کی سلائی سے ان دانوں کو چھید دیا اور اس طرح ان کی رطوبت خارج کر دی جس سے مریض کو بڑا سکون ملا۔ ۹

(۴) سوء القنیہ کے سلسلے میں ارزانی سفرجاز کا مشورہ دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''بہترین تدابیر او سفر حجاز است''۔ ۱۰

''اس کا (سوء القنیہ) بہترین علاج سفر حجاز ہے''۔

معالجات کی کتابوں میں اتنا ضرور ملتا ہے کہ سوء القنیہ کے ازالے کے لیے پیادہ پا اور تیز روی کے ساتھ سفر بہت مفید ہے لیکن سفرحجاز کا مشورہ میری نظر سے پہلی دفعہ گزرا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے سفر حج کی سعادت حاصل کی ہو اور انھیں یا ان کے کسی رفیق سفر کو سوء القنیہ کی شکایت رہی ہو اور وہ اس سفر کے دوران دور ہو گئی ہو۔

ارزانی کا مقام:

گیارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی تاریخ طب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ عرب، ایران اور خراسان سے ہندوستان میں فضلاء طب کی آمد کا جو سلسلہ ایک ہزار سال سے جاری تھا اس کی قابل ذکر آخری کڑی حکیم علوی خاں ہیں (وہ غالباً ۱۶۹۹ء میں آئے تھے)۔ ان کے بعد کوئی نامور فاضل طبیب یہاں نہیں آیا اور یہاں کوئی خاص ضرورت بھی نہیں محسوس کی گئی کیونکہ اس وقت محمد اکبر ارزانی، فاضل خاں، واصل خاں، بقا خاں، اعظم خاں، اسماعیل خاں، محمد حسین خاں اور شریف

خاں جیسے فضلاء طب پیدا ہو رہے تھے اور ان کی کتابوں کا معیار اور موضوع سترہویں صدی عیسوی سے بہت مختلف تھا۔ پہلے کتابوں کے موضوعات تھے طب ہند (آیورویدک) کے تراجم، مجربات، جلیات، مفردات، قرابادین وغیرہ۔

معیاری کتابیں بہت کم لکھی گئیں لیکن ان میں حسب ذیل خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

علی گیلانی کی شرح قانون، ابوالفتح گیلانی کی شرح قانون اور شرح قانونچہ، عبدالفتاح اسماعیل کی شرح قانونچہ، میر محمد ہاشم گیلانی کا حاشیہ نفیسی، عبدالرزاق لاہیجی کی خلاصۃ التشریح، نورالدین گیلانی کی طب داراشکوہی۔

بہر حال یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ یہ کتابیں عام نہ ہو سکیں۔ ان کے مخطوطات بھی بہت کم ملتے ہیں۔ بعض کتابوں کے صرف نام ہی نسخے میں ملتے ہیں۔

اس کے برعکس حکیم ارزانی سے جس دور کا آغاز ہوا اس میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کا معیار علمی تھا۔ کثرت سے ان کی نقلیں تیار کی گئیں۔ ان میں سے نصاب میں شامل کی گئیں، ان کی شرحیں لکھی گئیں۔ تراجم کیے گئے۔ غیر معیاری اور بے وزن کتابیں بھی کثرت سے لکھی گئیں مگر اس دور کی معیاری کتابوں کا تناسب، قبل ارزانی کے دور سے زیادہ ہے۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف عظیم حکمرانوں کا دور عالمگیر (۱۷۰۷ء) پر ختم ہو رہا تھا تو دوسری طرف حکیم ارزانی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کر رہے تھے (طب اکبر ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء)۔

ارزانی کی بلندی مقام اور رفعت مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکیم اجمل خاں نے جب التحفة الحامدیہ في الصناعة التكليسية کے نام سے عربی میں ایک رسالہ لکھا اور اس میں کشتوں کے استعمال کی تاریخ کے ساتھ ان کے استعمال کے جواز پر دلائل پیش کیے تو ان میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جو لوگ کشتوں کے استعمال کو خطرناک بتاتے ہیں وہ ان اطباء سے بے خبر ہیں جو کشتوں سے علاج کرتے رہے ہیں۔

''واحسب ان هولاء الغفلة لم يخبروا بان شاه ارزانی عالج بالمكلسات و كتبها في قراباديه وقال عند بيان بعض منها وهو مجرب ونقل مكلس الذهب والفضة الزنجفر واشار الى استعمال المسك والزرنيخ الى غير ذلك''۔ (ص ۲۲)

میں چاہتا ہوں کہ یہ بے خبر حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شاہ ارزانی نے کشتوں سے علاج کیا ہے اور اپنی قرابادین میں کشتہ جات درج بھی کیے ہیں

اوران میں سے بعض کو حاصل کیا اور وہ مجرب ہیں اور انھوں نے کشتۂ طلاء، کشتۂ نقرہ، شنگرف کو قرابادین میں درج کیا ہے۔ ترسم الفار اور ہڑتال کے استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حواشی

۱	قرابادین قادری، ص۳۶۲	۲	حدود والامراض، ص۵۹
۳	حدود الامراض، ص۵۹	۴	شرح الاسباب والعلامات، ص۲۹۰
۵	قرابادین قادری، ص۳۳۵۔۳۳۶	۶	قرابادین قادری، ص۳۰۱
۷	قرابادین قادری، ص۳۳۲	۸	حدود الامراض، ص۳۹
۹	مفرح القلوب، ص۵۲۱	۱۰	میزان الطب، ص۱۱

☆☆☆

مولانا شبیر انور اصلاحی مفتاحی اب ہمارے درمیان نہیں رہے

یہ کسے خبر تھی کہ ۶ر دسمبر ۲۰۱۰ء کی شب غم واندوہ کی شب ہوگی اور ہزاروں افراد کے لیے باعث درد والم ہوگی۔ لیکن مشیت ایزدی کے آگے ہر شخص مجبور و بے بس ہے۔ وہ چراغ اب ہمیشہ کے لیے بجھ گیا جس نے اپنی زندگی تعلیم وتدریس اور دین کی تبلیغ واشاعت میں صرف کردی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۵ء میں بخاور گنج، مئوناتھ بھنجن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسۃ الاصلاح اور مفتاح العلوم سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پورنیا (بہار) میں ایک مدرسہ میں مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگے۔ تحریک اسلامی سے وابستگی کی وجہ سے آپ مختلف پروگراموں میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بار آپ ایک اجتماع میں اشرف پور (اعظم گڑھ) تشریف لے گئے جہاں آپ کی ملاقات معزز تحریکی اشخاص سے ہوئی ان کی درخواست پر چند طلبہ کو لے کر ۱۹۶۲ء میں اسلامیہ مکتب (موجودہ نام جامعۃ الفلاح) سے منسلک ہوگئے۔ آپ نے جہاں جامعۃ الفلاح کے تعلیمی معیار اور تربیتی ماحول کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہیں طلبہ کے اندر خلوص کے ساتھ قوم وملت کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جامعہ کے لیل ونہار

عبدالرقیب فلاحی٭

دوماہی دعوتی وتربیتی کیمپ:

اس کیمپ کا آغاز ۱۸ر اکتوبر کو ابوالليث ہال میں ایک افتتاحی اجلاس میں ہوا، جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب شیخ ریاض موسیٰ ملیباری صاحب موجود تھے۔ الحمدللہ یہ کیمپ ۹ر نومبر ۲۰۱۰ء تک جامعہ کے مرکز الدعوۃ میں دعوۃ گروپ کے تعاون سے بحسن وخوبی اختتام کو پہنچا جس میں مختلف مدارس سے فارغ طلبہ کی تعداد ۱۷ر اور جدید تعلیم یافتہ طلبہ کی تعداد ۱۲ر کل ملاکر ۲۹ حضرات نے اس کیمپ سے باقاعدہ استفادہ کیا، جن کو سند سے بھی نوازا گیا۔

ہفتہ میں ۶ر دن دعوتی تجربات پر مشتمل تعلیم دی جاتی تھی تاکہ شرکاء دعوتی میدان میں عملی طور پر مضبوط ہوں اور بقیہ دن فیلڈ ورک کے لیے مختص تھا۔

اس کیمپ میں مختلف موضوعات پر مستقل لیکچر ہوئے اور قرآن کا دعوتی نظر سے حفظ ومطالعہ، حدیث وسیرت، سائنس اور اسلام، دعوتی دروس، تقابل ادیان، ایمان باللہ کے عناوین کے تحت باقاعدہ تدریسی نظام قائم کیا گیا تھا۔

چنانچہ اس پروگرام کے تحت بلریا گنج کے قرب وجوار میں بسے ہوئے برادران وطن کی ایک معتدبہ تعداد تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ چند ایک کو چھوڑ کر برادران وطن کا تاثر مثبت (Positive) رہا ہے۔ بلکہ بعض نے تو اس دعوت کے اب تک نہ پہنچنے کا شکوہ بھی کیا۔ الحمدللہ ان میں سے کچھ لوگوں نے کلمہ بھی پڑھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کام مسلسل کیا جائے اور جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے ان سے مستقل رابطہ رکھا جائے تاکہ اس سے استحکام پیدا ہو۔

مرکز تعلیم اساتذہ کی مجلس علمی کی نشست:

مرکز تعلیم اساتذہ کی مجلس علمی کی ایک میٹنگ بتاریخ ۹ و ۱۰ر اکتوبر ۲۰۱۰ء مرکزی لائبریری میں منعقد ہوئی۔ پہلی نشست کا آغاز ۸:۳۰ر بجے صبح عبدالرقیب فلاحی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔

٭معاون سکریٹری رابطہ عامہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

محترم ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے استقبالیہ کلمات کے بعد ڈاکٹر ابرار اعظمی صاحب رکن مجلس شوریٰ جامعہ و ڈائرکٹر مرکز تعلیم اساتذہ نے مجلس علمی کی اس نشست کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد مجوزہ نصاب پر غور و خوض کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۰ر اکتوبر کی شام تک بحیثیت مجموعی غور و خوض کے بعد ایک ابتدائی شکل دے دی گئی۔ اس نشست میں متعدد ماہرین تعلیم نے شرکت کی جن میں پروفیسر شبیر حسن جوشی صاحب، ڈاکٹر بدرالاسلام صاحب، پروفیسر محمود صدیقی صاحب، شیخ عظیم الدین صاحب وغیرہم بھی تھے۔ ان حضرات کی کاوشوں سے ان شاء اللہ ''مرکز تعلیم اساتذہ'' ایک مثالی ادارہ بن سکے گا۔

سانحہ ارتحال:

یہ خبر انتہائی دردانگیز ہے کہ کارکن جامعہ مولوی شاہد الاسلام فلاحی صاحب کی والدہ محترمہ شدید علالت کی وجہ سے ۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۰ء کی شب میں انتقال کر گئیں۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) مرحومہ نیک سیرت خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ابھی یہ زخم مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۷ر اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ایک اور سانحہ پیش آیا۔ تقریباً ۱ بجے شب میں جامعہ کے ایک عظیم محسن و رکن اساسی مجلس شوریٰ حاجی امانت اللہ صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

جامعہ کی تعمیر و ترقی میں مرحوم کی خدمات بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو صدقۂ جاریہ کے طور پر قبول فرمائے اور بال بال مغفرت فرمائے نیز پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

برادر ڈاکٹر محمد یونس فلاحی کو صدمہ:

یہ خبر انتہائی پُر ملال ہے کہ برادر محترم ڈاکٹر محمد یونس فلاحی (رکن مجلس شوریٰ، انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح) کے والد محترم جناب محمد اسحاق، ۸۳ سال کی عمر میں مورخہ ۳ر دسمبر ۲۰۱۰ء بروز جمعہ دار فانی سے دار البقاء کی طرف کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم جماعت اسلامی ہند (بھساول، مہاراشٹر) کے فعال کارکن تھے۔ وہ انتہائی ملنسار، نیک سیرت اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمعیۃ الطلبہ کے نو منتخب ذمہ داران کا افتتاحی اجلاس:

مورخہ ۱۱ر نومبر ۲۰۱۰ء بروز جمعرات ۱۰:۴۵ بجے ابو اللیث ہال میں ایک افتتاحی تقریب

منعقد ہوئی، جس کی صدارت محترم ناظم جامعہ نے فرمائی۔ سابق ذمہ داران جمعیۃ الطلبہ نے نو منتخب ذمہ داران جمعیت کو مبارک باد پیش کی اور یہ مشورہ دیا کہ اتحاد و اتفاق اور ٹیم اسپرٹ کے ساتھ ملوظہ ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

آخر میں صدر مجلس محترم ناظم جامعہ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ جمعیت آپ کی ہے، اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور اس کے پروگراموں میں حصہ لیں۔ جو کچھ ہمیں میسر ہے اس کو اچھے ڈھنگ سے استعمال کریں۔ جامعہ کا جو مقصد ہے اس کو پانے کی کوشش کریں۔ احساس ذمہ داری اپنے اندر پیدا کریں۔ نیز فرمایا کہ جس طالب علم کی حاضری سب سے اچھی ہوگی، اور جو سالانہ امتحان میں اچھے نمبرات حاصل کرے گا اور تقریر و تحریر میں جس کی کارکردگی نمایاں ہوگی، ان سب کو ایک ایک ہزار روپے کی کتابیں بطور انعام دی جائیں گی۔

مہتمم تعلیم و تربیت مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحب کے اختتامی کلمات و دعا پر پروگرام ختم ہوا۔

جمعیۃ الطلبہ کے نو منتخب ذمہ داران:

۱ -	سکریٹری	شیخ عظیم الدین
۲ -	لائبریرین	عبدالرب سلیم
۳ -	معتمد خطابت	زاہد اختر
۴ -	معتمد تحریر	رئیس مبین
۵ -	معتمد رسائل و جرائد	شاہد حبیب

سہ ماہی امتحان کا آغاز:

جامعہ کا سہ ماہی امتحان ۱۲ر دسمبر سے شروع ہو کر ۱۹ر دسمبر کو ختم ہو جائیگا۔ یہ امتحان دو شفٹوں میں (صبح و شام) ہوگا۔ اس کے بعد حسب معمول کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔

فہرست منتخب ارکان مجلس نمائندگان

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

برائے میقات ۲۰۱۱ء-۲۰۱۳ء

نمبر شمار	حلقہ دہلی	۱۶	حافظ ادہم علی
۱	مشرف حسین صدیقی	۱۷	عبدالسمیع
۲	نعیم احمد غازی	۱۸	شمس الدین
۳	شمشاد حسین	۱۹	عبدالحفیظ
۴	وسیم احمد غازی	۲۰	محمد فیاض
۵	حسن محمد بناء	۲۱	دانش ریاض
۶	جرار احمد	۲۲	صبغۃ اللہ عمر
۷	اشتیاق دانش		حلقہ اعظم گڑھ و اطراف
۸	ساجد خلیل	۲۳	زریاب احمد
۹	انیس احمد	۲۴	رحمت اللہ اثری
۱۰	احتشام الدین	۲۵	عرفان احمد
۱۱	آصف نواز	۲۶	کمال الدین
۱۲	ابوسعد اعظمی	۲۷	اسرار احمد
۱۳	ابوالکارم	۲۸	انیس احمد
۱۴	عبدالباری	۲۹	عبدالعظیم
	حلقہ مہاراشٹر	۳۰	عبدالرحمٰن خالد
۱۵	ڈاکٹر محمد یونس	۳۱	افضال احمد
۳۴	محمد افضل	۳۵	محی الدین ساجد

	حلقہ ساوتھ انڈیا		حلقہ مغربی یوپی و اترا کھنڈ
۳۳	صباح الدین ملک		
	حلقہ ہریانہ و گجرات	۴۶	ثاقب حسین
۳۴	قاسم رسول	۴۷	ضیاء الرحمٰن
۳۵	محمد نعیم بن محمد سلیم		حلقہ لکھنؤ و اطراف
	حلقہ جموں و کشمیر	۴۸	ملک محمد فیصل
۳۶	محمد عرفان بن محمد امین	۴۹	انعام اللہ
	حلقہ بہار و جھارکھنڈ	۵۰	اظہر الدین
۳۷	احمد اللہ	۵۱	ولی اللہ سعیدی
۳۸	نایاب حاذق	۵۲	مقبول احمد
	حلقہ علی گڑھ		حلقہ قطر
۳۹	ضمیر الحسن	۵۳	فیاض احمد
۴۰	ضیاء الدین ملک		حلقہ برطانیہ
۴۱	عمر فاروق	۵۴	غلام نبی
۴۲	سمیع اختر		حلقہ نیپال
۴۳	ملک محمد ارشد	۵۵	فیروز عالم
۴۴	انور کمال صدیقی	۵۶	وثیق الرحمٰن بن سعید انصاری

مقبول احمد فلاحی
(کنوینر انتخابی کمیٹی)

غزل

آستینوں میں چھپا کر اس نے خنجر رکھ لیے
جب ہوا معلوم میں نے دل پہ پتھر رکھ لیے

ایک شاعر نے بت کافر کے پیکر رکھ لیے
اپنی آنکھوں میں بسا کر دل پہ نشتر رکھ لیے

اب چلی بھی جائے بینائی تو مجھ کو غم نہیں
میں نے آنکھوں میں سجا کر سارے منظر رکھ لیے

رزق تو رزاق دے گا جام و مینا کون دے
اس لیے غالب نے گھر میں بھر کر ساغر رکھ لیے

ابرہہ سے جا کے کہہ دو اب نہ ڈھائے مسجدیں
اب حفاظت کے لیے ہم نے بھی کنکر رکھ لیے

بے یقین لائیں گے وہ ایمان سن کر شعر کو
ہم نے اشعاروں میں لفظوں کے پیمبر رکھ لیے

اب ہمارے دل کو صابر کوئی خطرہ نہیں
ضبط کے جتنے تھے گوہر ہر دل کے اندر رکھ لیے

از
محمد صابر ایوبی (دہلی)
Mobile: 9213986021

طلب العلم فریضة

مسلم بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا سفر

مدرسة المحسنات للبنات

احمد منزل، گھسیاری منڈی، مچھلی محال، لکھنؤ، یوپی

زیر سرپرستی

جناب مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب

Prop.: K. M. Khalid
Cell: 9820801169

Tel. : 2372 0719
Fax : 2375 6521
Resi : 2633 8477

AFKAR TUBE CORPORATION

Stockist & Suppliers of:

Seamless Steel Impulse Pipes & Tubes,
Boiler Tubes, Hydraulic Tubes, E.R.W. Tubes,
Square & Rectangular Hollow Sections
and Fabricated Pipes

B.P.T. Plot No. 131, Shop No. 6-B, Reay Road, Mumbai - 400 033
E-mail: afkartubes@gmail.com